پیاز کے چھلکے
ممتاز مفتی

فہرست

پیش لفظ

مضامین کا یہ مجموعہ جو میں کتاب کی صورت میں پیش کر رہا ہوں شخصیتوں سے متعلق ہے۔

انسان کی شخصیت ایک گورکھ دھندا ہے۔ ایک ایسا الجھاؤ جس کا سرا نہیں ملتا۔

میری دانست میں انسانی شخصیت کو پیاز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ فرد کی حیثیت چھلکے کی ہے۔ چھلکے ہی چھلکے، چھلکے ہی چھلکے۔ ایک دوسرے سے نہیں ملتا، ایک دوسرے کی شکل قطعی طور پر مختلف۔۔۔ اگرچہ بظاہر وہ سب ایک سے نظر آتے ہیں۔ بظاہر سپاٹ مگر غور سے دیکھو تو ان میں رنگ کی دھاریاں ہیں۔ ہلکے مگر واضح خطوط ہیں۔ منفرد بیل بوٹے ہیں۔ اگر آپ ان چھلکوں کے قریب جائیں تو آپ اشکبار ہو جائیں گے۔ چونکہ ان چھلکوں میں دکھ کی تلخی ہے۔ دکھ انسانی شخصیت کا جزو اعظم ہے۔ دکھ انسانیت کا پایہ ستون ہے۔ انسان کی مسکراہٹیں، مسرتیں قہقہے، عیاشی بھرا جنون، آنسوؤں کی جھیل میں اُگے ہوئے کنول ہیں۔

گہرائی کو مد نظر رکھیں تو انسانی شخصیت جادوگر کے ڈبے کی مصداق ہے۔ ایک ڈبہ کھولو تو اندر سے دوسرا ڈبہ نکل آتا ہے۔ دوسرا کھولو تو تیسرا نکل آتا ہے، تیسرا کھولو تو چوتھا۔ ڈبے میں ڈبہ، ڈبے میں ڈبہ۔

تضاد کو دیکھیں تو انسانی شخصیت فقیر کی گدڑی کی مانند ہے جس پر رنگا رنگ کے پیوند لگے ہیں۔ ہر ٹکڑا دوسرے سے مختلف ہے۔ تضاد ہی تضاد۔

فرد کی شخصیت ایک سرائے کی طرح ہے جس میں بھانت بھانت کے لوگ بستے ہیں۔ سفید ریش عابد، مونچھ مروڑ کر آنکھیں دکھانے والا غنڈہ۔ دوسروں کا غم کھانے والا

احمق "میں" سے پھولا ہوا خود پسند۔ نچلا شریر بچہ۔ محبت کا پیاسا، ظالم، دکھی، عفریت اور جانے کیا کیا۔

انسانی شخصیت کے ان گنت پہلو ہیں۔ لیکن سب سے ظالم پہلو اس کی پرکار سادگی ہے وہ رنگا رنگ شیشوں کی بنی ہوئی قندیل نہیں جو ہر رنگ میں جلتی ہے بلکہ وہ ایک سادہ اور مدھم شعلہ ہے جو بظاہر ایک رنگ میں جلتا ہے مگر اس ایک رنگ کے پردہ میں ہفت رنگیت چھپائے ہوئے ہے۔

مجھے انسانی شخصیت کو سمجھنے کا زعم نہیں۔ شخصیت کی بھول بھلیاں سمجھنے کیلئے نہ تو علم ہے نہ دل کی وہ حس جس کے بغیر اسے سمجھنا ممکن نہیں۔ اس لئے یہ مضامین محض جھلکیاں ہیں۔ ادھوری جھلکیاں خام جھلکیاں۔

عام طور سے ادب میں شخصیتوں کے خاکے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان خاکوں میں ظاہری شخصیت کے خدوخال ہوتے ہیں۔ مجھے خاکوں سے دلچسپی نہیں چونکہ میرے نزدیک ظاہری شخصیت اصلی شخصیت کے سرپوش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لہذا ان مضامین میں آپ کو شخصیت کے خاکے نہیں ملیں گے۔

ان مضامین میں تجزیے کا عنصر حاوی ہے پوری شخصیت کا نہیں بلکہ کسی بنیادی خصوصیت کا جو میرے نقطہ نظر سے اس شخصیت کا جزو اعظم ہے۔

اس مجموعے میں ادیبوں کی شخصیتوں پر مضامین ہیں۔ ادیب کی شخصیت عام شخصیت سے اتنی مختلف ہوتی ہے جتنا پانی مٹی سے۔ ادیب کی شخصیت میں سیال عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہ سیال عنصر پارے کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی لہروں میں سمندر کی سی روانی ہوتی ہے۔ مدوجزر اٹھتی ہے۔ چھینٹے اڑتے ہیں۔ جھاگ پیدا ہوتا ہے۔ روئیں چلتی ہیں۔ گھمنگھیریاں گھومتی ہیں۔ گرداب پڑتے ہیں۔

ادیب کی شخصیت میں دو خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں، شدت اور تضاد۔ وہ چمگادڑ کی مصداق ہے جو بیک وقت چوپایہ بھی ہے اور پرندہ بھی۔ ممکن ہے ان مضامین میں کہیں کہیں آپ ادیب کی شخصیت کی جھلکی دیکھ سکیں اور اس کے المیہ کو جان سکیں۔

اس کتاب کی پیشکش کی تمام تر ذمہ داری "لکھ یار" پر عائد ہوتی ہے۔ "لکھ یار" ایک مختصر سی انجمن ہے جس کا مقصد ارکان کو لکھنے پر مائل کرنا ہے۔ رکن بنتے وقت مجھے یہ علم نہ تھا کہ مائل کرنے کے عمل میں زچ کرنا بھی شامل ہو سکتا ہے اور ایک ادبی انجمن غیر ادبی ذرائع بھی استعمال کر سکتی ہے۔ بہر حال میں انجمن کے سیکرٹری مسعود قریشی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے علم میں اضافہ کیا۔

اس مجموعے میں پہلے دو مضامین میری شخصیت پر ہیں۔ ایک مسعود قریشی نے لکھا ہے اور دوسرا احمد بشیر نے۔ تیسرا مضمون میں نے خود اپنے بارے میں تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں میں نے اپنی شخصیت کا تجزیہ نہیں کیا بلکہ چند حقائق بیان کئے ہیں جو شاید میری تحریروں کو سمجھنے کیلئے مدد معاون ثابت ہو سکیں۔

چوتھا مضمون پاکستان پر ہے۔ شاید آپ سوچیں کہ شخصیتوں کے تذکرے میں پاکستان کے ذکر کے کیا معنی۔

پتہ نہیں کیوں میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان بھی ایک شخصیت ہے۔ ادیب سے زیادہ پراسرار اور جاذب شخصیت۔ میرا یہ مضمون پاکستان کی شخصیت کی وضاحت نہیں کرتا۔ صرف اس جیتی جاگتی شخصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مجھے اس پراسرار شخصیت کے متعلق بہت کچھ کہنا ہے۔ بہت کچھ۔ دقت یہ ہے کہ میرے تجربات اور مشاہدات گذشتہ دس سالوں میں ایک ایسے راستے پر چل نکلے ہیں جو عقل وخرد سے ہٹ کر ہے اور دانشوروں کیلئے جاذب نظر نہیں۔۔۔ اور ابھی تک میں کوئی ایسا زاویہ تحریر حاصل نہیں کر سکا جس کی مدد سے Extra Sensory Perceptions سے متعلقہ مشاہدات ایسے انداز میں پیش کر سکوں کہ وہ دانشوروں کیلئے ناقابل قبول نہ ہوں۔ ایسا زاویہ تحریر جس میں تاثر ہو۔ جو قاری کو کم از کم میرے خلوص کا یقین دلا سکے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ میں ایسے موضوعات پر قلم نہ اٹھاتا جب تک مجھے وہ زاویہ تحریر

حاصل نہ ہو جاتا۔ جب تک میری بات تاثر سے بھیگ نہ جاتی۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ اپنے مشاہدات پر قلم اٹھانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ آپ بھی میرے مشاہدات میں شریک ہو سکیں یا شاید اس لئے کہ اپنے آپ کو "نہ کہنے" کی گھٹن سے نجات دلاؤں۔

ممتاز مفتی

راولپنڈی

۲۴ ستمبر ۱۹۶۸ء

او نہیں جی۔ ایہہ گل نہیں

مسعود قریشی

دیکھئے صاحب اس جملے پر بدکئے نہیں۔ مفتی کا اس جملے سے یہ مطلب نہیں کہ وہ آپکی بات کو لغو سمجھتا ہے اور آپ سے متفق نہیں۔ یہ تو محض اس کا انداز تخاطب ہے۔ آخر مخاطب کرنے کے لئے کوئی جملہ تو کہا ہی جاتا ہے نا۔ دیکھئے صاحب سنئے صاحب میں کہتا ہوں یا کچھ اور۔ بس مفتی کا بھی اس قسم کا خطابیہ جملے کے طور پر یہ الفاظ کچھ موزوں نہیں۔ بلکہ زیادہ موزوں نہیں یا بالکل ناموزوں ہیں۔ خواہ مخواہ دوسرا آدمی چڑ جاتا ہے۔ ایک قسم کی resistance پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ مفتی کو جانتے ہیں تو resistance پیدا ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ اور اگر آپ کی پہلی ملاقات ہے اس کی شخصیت اور گفتگو اپنانے کے کئی پہلو موجود ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ پہلی ملاقات میں اس سے یہ جملہ سن کر مجھے بڑا غصہ آیا تھا۔ دیکھئے پہلی ملاقات میں تو انسان ملاقاتی سے ہر ممکن طور پر متفق ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے اپنے دوستوں کا تعارف کرایا اور وہ دونوں شرفا کی طرح ایک دوسرے کو اپنانے کے لئے ہر بات میں متفق ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ بات چیت کا انداز کچھ ذاتی سا تھا۔ چنانچہ ایک صاحب جو کافی بڑے افسر تھے اور اس لئے بلا کسی خطرے کے اپنی نالائقی کی داستانیں سنا سکتے تھے۔ کہنے لگے کہ وہ میٹرک میں تین دفع فیل ہوئے۔ دوسرے صاحب شومئی قسمت سے کلرک قسم کی چیز تھے۔ اس لئے ان پر واجب تھا

کہ اپنی مفروضہ ذہانت کے قصے سنائیں۔ اور وہ سنایا بھی کرتے تھے۔ لیکن پہلی ملاقات کا مسئلہ تھا۔ شرافت کا تقاضا تھا کہ اتفاق کی راہ نکالی جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی کہا کہ وہ نویں جماعت میں چار دفعہ فیل ہوئے تھے۔ دونوں میں یہ بات بھی مشترک نکلی کہ بچپن میں کافی غربت میں زندگی گزاری تھی۔ سکول سے عموماً ناغہ کیا کرتے تھے۔ استادوں کا ادب بالکل نہیں کیا کرتے تھے۔ اور دونوں کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔ اتفاقاً میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ان کے والد کی حال ہی میں وفات ہوئی ہے۔ وہ صاحب تھوڑی دیر کے لئے جھجکے اور پھر نیچی نظروں سے فرمانے لگے۔ میرا والد بھی کئی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اور چند ہی دنوں میں وفات پانے والا ہے۔

دیکھئے نا پہلی ملاقات میں شریف لوگ تو اتفاق رائے کے لئے اس حد تک پہنچ جاتے ہیں اور ایک یہ مفتی ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں "او نہیں جی۔ ایہہ گل نہیں" کا ٹھیٹھ پنجابی لٹھ مارتا ہے۔ چنانچہ صاحب آپ کی طرح مجھے بھی غصہ آیا، لیکن مروت کی وجہ سے خاموش رہا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مروت کی ایک ہی نشانی ہے کوئی کچھ کہے۔ کچھ کرے۔ بس خاموش رہو۔ لیکن جلد ہی مجھے اپنے غصے پر ہنسی آنے لگی وجہ یہ تھی کہ مفتی اپنے اس جملے کے باوجود مجھ سے اختلاف نہیں کر رہا تھا۔ اب اچھی طرح یاد نہیں کہ بات کا موضوع کیا تھا کیونکہ یہ مری کی بات ہے اور پہاڑوں کی باتیں میدانوں میں کون یاد رکھتا ہے۔ لیکن اس میں قطعی شک نہیں کہ مفتی بات میرے حق میں ہی کہہ رہا تھا۔

دراصل قصہ یوں ہے کہ مفتی لاشعور کا دیوانہ ہے اور اگر بے شعور نہیں تو کم از کم شعور کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے خیال میں بات کا اصل مطلب ظاہر الفاظ سے ہٹ کر ہوتا ہے کہ باقی لوگ بھی یہ سمجھتے ہوں گے کہ وہ کہی سے زیادہ ان کہی پر توجہ دیتا ہے۔ جب آپ اس سے بات کریں تو وہ غور اس بات پر نہیں کرے گا۔ جو آپ لفظوں کے قالب میں اس تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس کی توجہ اس حصے پر ہوگی جو آپ حذف کر رہے ہیں۔ بات تو عجیب سی ہے لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود اسے سمجھدار انسان کہا جاتا ہے۔

یہی حال اس کے افسانوں کے کردار کا ہے۔ "آپا" تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ جی ہاں بڑی ہی پیاری کہانی ہے۔ سات زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ویسے یہ سن کر آپ کو حیرانی ہوگی کہ مفتی اسے اپنی بہترین کہانیوں میں شمار نہیں کرتا۔ اس بات میں تو وہ بالکل استاد یوسف ظفر ہے۔ دونوں کو اپنی بہترین تخلیقات ہمیشہ بھول جاتی ہیں اور اگر یاد رہیں تو وہ انہیں بہترین نہیں سمجھتے۔ یہ نقص صرف ان دو میں ہی نہیں دنیا کے تقریباً ہر بڑے ادیب میں ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ اپنی پچھلی تخلیقات میں انہیں تخیل اور جذبے کی وہ عظمت نظر آتی ہے جو ان کے ذہن میں تھی۔ لیکن لفظوں میں نہ ڈھل پائی اور قاری تک نہ پہنچ سکی۔

ہاں تو میں "آپا" کا ذکر کر رہا تھا۔ اس میں کئی ایک کردار ہیں بھائی جان وہ باتیں تو کرتے ہیں بدو سے لیکن مخاطب ہوتی ہے آپا بات تو کرتے ہیں کیرم کی اور مقصد ہے بازی محبت کی حیرت یہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں یہ انداز بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کرداروں کی اصل شخصیت پڑھنے والے پر آئینہ ہو جاتی ہے لیکن بات چیت میں مفتی یہ انداز پوری طرح نہیں اپناتا۔ شاید اس لئے کہ باتوں میں مفتی خلوص سے بات کہنے کی بجائے پسندیدہ ہونے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے اور پسندیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے والے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے اس لئے کہ میں اس کوشش میں عموماً ناکام رہتا ہوں۔

افسانہ نگار مفتی نے تو جب سے ہوش سنبھالا۔ رسالوں۔ کتابوں کے ذریعے ملاقات رہی۔ شعور و لاشعور کی بھول بھلیاں تو نہ اس وقت سمجھتے تھے نہ اب لیکن اس کے افسانے پڑھنے میں لطف بہت آتا تھا۔ عام افسانہ کرداروں کی عام باتیں اور ان عام باتوں میں عام معنوں سے ہٹے ہوئے معنی۔ ڈھکے چھپے پہلو۔ اس کی ایک کہانی۔ نفرت۔ تو پڑھی ہوگی۔ آپ نے بھی "ان کہی" میں ہے۔ وہ کہانی، خیر میں سناتا ہوں۔ ایک گاڑی میں دو لڑکیاں سفر کر رہی ہیں۔ ایک نازلی۔ حسین شوخ پردے سے نفرت کرتی ہے اور زرد رنگ کی عاشق ہے۔ دوسری لڑکی نجمہ نازلی کی بھاوجہ اور اس کی سہیلی ہے۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رکی۔

"لاحول ولا قوۃ"۔

نجمہ نے نازلی کو لاحول پڑھتے سنا۔ دیکھا تو اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

کیا ہے میں نے پوچھا۔

اس نے انگلی سے پلیٹ فارم پر ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ بنچ پر بجلی کی روشنی کے نیچے دو جوان کھانا کھا رہے تھے۔

"توبہ جانگلی معلوم ہوتا ہے۔ کیسے بھدے اعضاء ہیں"۔ نازلی نے جھرجھری لی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "تم خواہ مخواہ لوگوں پر بگڑ رہی ہو۔ جانگلی ہے تو پڑا ہوا کرے"۔ میں نے کہا۔

"اسے کھاتے ہوئے تو دیکھنا۔ توبہ ہے" نازلی نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔ اس کا چہرا ہلدی کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے۔ توبہ نازلی نے نحیف آواز میں کہا۔ اس کا بس چلے تو کچا ہی کھا جائے کوئی مردم خور معلوم ہوتا ہے۔

"مگر تم نے شادی سے کیوں انکار کیا"۔ جانگلی کا ساتھی کہہ رہا تھا۔ "بس اس لئے کہ مجھے بے پردگی سے سخت نفرت ہے۔ اور وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ آج کل کا بناؤ سنگار مجھے قطعی پسند نہیں۔ آج کل تو عورتیں یوں برقعے اٹھائے پھرتی ہیں جیسے جنگل میں شکاری بندوقیں اٹھائے پھرتے ہیں اور جو لڑکی زرد دوپٹہ پہن سکتی ہے۔ میں اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ مجھے زرد رنگ سے چڑ ہے"۔

اس ٹکڑے سے آپ یہی سمجھتے ہوں گے کہ نازلی کو اس گنوار سے شدید نفرت اور وحشت تھی اور اس کی باتوں سے یہ نفرت شدید تر ہو گئی ہوگی۔ لیکن نہیں صاحب مفتی کے فلسفہ زندگی میں الفاظ اور حرکات کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو ظاہر کیا جا رہا ہے بلکہ وہ جسے چھپانے کی کوشش ہو رہی ہے چنانچہ اصل کیفیت نازلی کے گھر پہنچنے پر کھلتی ہے۔

اگلے دن دوپہر کے قریب مظفر بھائی (نازلی کے شوہر) میرے (نجمہ کے) کمرے میں تشریف لائے۔ ان کے چہرے پر پریشانی اور تشویش کے آثار تھے، کہنے لگے۔

"نجمہ نازلی کو کیا ہو گیا ہے۔ کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں"۔

"خدا جانے کیا بات ہے۔ اس میں وہ پہلی سی بات ہی نہیں۔ آج صبح سے ہر بات کے جواب میں نہایت فرمانبرداری سے۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔ ہو رہی ہے۔ نازلی اور جی ہاں کہے میں سمجھا مجھ سے ناراض ہے شاید"۔

"نہیں ویسے ہی طبیعت ناساز ہو گی"۔

" اگر طبیعت ناساز ہوتی تو کیا وہ باورچی خانے میں بیٹھی کام کرتی۔ وہ تو صبح سے باورچی خانے میں حشمت کے پاس بیٹھی ہے۔ کہتی ہے میں کھانا پکانا سیکھوں گی"۔

دو قدم چل کر وہ رک گئے۔

"اور مزے کی بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا۔ جانتی ہو نا اسے زرد رنگ سے کتنا پیار ہے۔ میں نے اس مرتبہ ایک نہایت خوبصورت زرد دوپٹہ اس کے لئے خریدا تھا۔ خیال تھا وہ دیکھ کر خوشی سے ناچے گی۔ مگر اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہیں کھونٹی سے لٹک رہا ہے"۔ (نفرت۔۔۔ ان کہی)

دیکھا آپ نے۔ مفتی کے ہاں عام الفاظ اور حرکات طرح طرح کیا معنی پہن لیتے ہیں، ان دنوں ہم سب دوست نہ صرف فرداً فرداً اس کے افسانے پڑھتے بلکہ چسکے کے لئے باجماعت اس کی تلاوت کرتے۔ فرائڈ کا نام ہم نے نیا نیا سنا تھا۔ اور ہمارے ایک دوست حبیب اللہ بیگ نے چسکے کے لئے ہیولاک ایلس کی کیس ہسٹریاں بھی پڑھی تھیں، چنانچہ سب لوگوں کا خیال تھا کہ مفتی بھی ایسی کیس ہسٹریاں سامنے رکھ کر کہانی کے تانے بانے بنتا ہے۔ اس عمر میں یہ گمان کیسے گذرتا کہ یہ انوکھے پہلو کسی شخص کے اپنے مشاہدے یا تجربے کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ اگر ہو سکتے تو ہمارے بھی ہوتے اور چونکہ ہمارے نہیں تھے لہٰذا لازم ٹھہرا کہ کتابوں سے لئے گئے تھے۔ اس وقت ان باتوں پر ہنسی آتی تھی۔ آج کل حقیقی زندگی میں جب لوگوں کے الفاظ اور حرکات کے خول سے متضاد حقیقت کھلتی ہے تو اس ہنسی پر ہنسی آتی ہے۔

پہلی دفعہ ایسے شخص سے جس نے گوشت پوست کے مفتی کو دیکھا تھا پشاور میں

ملاقات ہوئی۔ اچھی بھلی شکل وصورت اور رنگ روپ (مفتی کی نہیں) اچھا بھلا نام۔ جلیل۔ لیکن ساتھ کریر کی دم لگائے ہیں جس کی نسلی وجہ تو جو ہو سو ہو جمالیاتی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آسکی۔ ویسے کچھ ہو گی ضرور ورنہ کون بھلا آدمی محض نسلی بناء پر کریر جیسا دم چھلا چپکائے رہے گا۔ پشاور کے باہر ہوٹل میں بیٹھے گپ بازی کر رہے تھے۔ بے سلسلہ باتیں۔ سیاست کی۔ ادب کی۔ جانوروں کی، جانے کیسے مفتی کا ذکر آگیا۔ کہنے لگا۔

یار بڑا دلچسپ آدمی ہے۔

دلچسپی کا میں بھی قائل تھا۔ دلچسپی کی نوعیت جاننے کا اشتیاق ہوا۔ معلوم ہوا کہ ان کا علم بھی واجبی ہے۔ ایک بات انہوں نے البتہ بتائی۔ کہنے لگے کہ ایک دن مفتی صاحب ایک تانگے میں خواجہ دل محمد روڈ سے گزر رہے تھے۔ دو ایک اور دوست بھی ساتھ تھے۔ ہچکولے لگے تو کسی نے سڑک کی شکستہ حالت اور کارپوریشن کی بے توجہی کا رونا رو دیا۔ مفتی صاحب کہنے لگے او نئیں جی۔۔ سڑک کا کیا قصور۔ ذہن میں ہچکولے ہوں تو ہموار سڑک پر بھی لگیں گے اور نہ ہوں تو یہ سڑک بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

اس فقرے نے بڑا لطف دیا دیر تک ہنستے رہے اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہو گیا کہ مفتی افسانے بھی کتابی لکھتا ہے اور باتیں بھی کتابی کرتا ہے۔ مفتی سے پہلی ملاقات مری میں ہوئی تھی یہ یوسف ظفر کے ہمراہ وہاں آیا تھا۔ ظفر سے پشاور میں ایک مشاعرے میں ملاقات ہو چکی تھی۔ انہوں نے مفتی سے تعارف کرایا۔ میں ادیبوں سے ملاقات کرنے سے بہت کتراتا ہوں۔ یہ ملاقاتیں بہت غیر فطری اور طبیعت پر بار ہوتی ہیں۔ آپ اس شخص کی تخلیقات پڑھ کر ذہن میں ایک تصور قائم کر چکے ہوتے ہیں۔ ادبی تخلیقات چونکہ دل ودماغ کا حسین امتزاج ہوتی ہیں اس لئے عموماً ایک بڑی ذہین اور شفاف قسم کی تصویر آپ کے تصور پر نقش ہو چکی ہوتی ہے۔ جب ملاقات ہوتی ہے تو ایک بہت عام بلکہ عام سے بھی گھٹیا شخص سے۔ چنانچہ ذہن کی تصویر چکنا چور ہو جاتی ہے اور اگر آپ اس شخص کی طرح محسوس کرتے ہیں جو کورٹ شپ کے رومانی اور رنگین دھندلکوں میں سے خوابوں کی ملکہ کو دیکھنے کا عادی

ہونے کے بعد پہلی مرتبہ حقیقت کی دنیا میں اس محبوبہ کو بیوی کے روپ میں دیکھتا ہے، دوسری وجہ بھی ہوتی ہے کہ جب کسی ادیب کی کسی سے ملاقات کرائی جائے تو وہ خواہ مخواہ اپنے لفظوں اور حرکات سے ملاقاتی پر اپنے فوق البشر ہونیکا نقش چھوڑنے پر مصر ہوتا ہے۔ انجام یہ کہ ایک مصنوعی کھوکھلے ماحول میں دونوں ملتے ہیں اور ایک دوسرے سے بیزار رخصت ہوتے ہیں۔ چنانچہ چند ایک ایسے ہی تجربوں کے بعد میں ایسی ملاقاتوں سے کترانے لگا تھا۔ بہر حال مری میں تالاب کے قریب سردیوں کی ایک شام پانچ فٹ چار انچ کے اس منحنی افسانہ نگار سے ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقات کے رسمی فقروں کے بعد پہلی ہی کسی بات پر جبکہ یوسف ظفر اپنی مونچھیں نتھنوں میں سمیٹے دانت ہونٹوں پر دھرے مسکرا کر جی بھائی جی، کی رٹ لگا رہا تھا۔ مفتی نے اپنے اجڈ پنجابی لہجے میں کہا۔ او نئیں جی۔ ایہہ گل نئیں۔

بڑا غصہ آیا تھا مجھے۔

بن رہا ہے۔ بڑا افسانہ نگار ہی سہی۔ لیکن انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔

میں نے سوچا اور پھر دو تین منٹ بعد ہی یہ ساری بناوٹ اور جھجھک نہ جانے کیسے ختم ہو گئی یہ بھول کر کہ میں اس وقت منٹو کے بعد ہندوستان کے عظیم ترین افسانہ نگار سے ابھی ابھی متعارف ہوا ہوں۔ ہم عام دوستوں کی طرح عام سی باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔

اس کے بعد مری میں اس سے ملاقاتیں رہیں۔ اس کے کمرے میں جب پہلے پہل آنا جانا شروع کیا تو بڑی کوفت ہوئی تھی۔ سارا سارا دن اپنے گندے بستر میں گندا سا پاجامہ اور قمیض پہنے پڑا رہتا۔ دوسرے کونے میں یوسف ظفر کا ڈیرا ہوتا۔ کئی کئی دن وہ منہ نہ دھوتا۔ بس پڑا چائے پیتا۔ تاش کھیلتا۔ گپ بازی کرتا اور لکھتا۔ باہر آنے جانے سے کتراتا، کہتا۔

مجلسی آدمی نہیں ہوں۔ داخلیت پسند ہوں۔ اپنی تو ذات ہی کنواں ہے۔ اگر کبھی مجبور کر کے باہر چلنے کے لئے اسے تیار بھی کرتے تو مناسبت کا خیال کئے بغیر کپڑے پہنتا۔ نٹ کا خیال کئے بغیر ٹائی لگاتا۔ استری کے بغیر پتلون پہنتا اور یوں بے پرواہ چل دیتا۔

جیسے کسی واقف نے ملاقات کا خطرہ ہی نہیں۔ مفتی کو اس حالت میں مال روڈ پر یا ریستوران میں جب دوسرے خوش پوش لوگ گھورتے تو ہم نادم ہو جاتے لیکن اسے ذرا برابر خیال نہیں آتا۔ اپنے بے تکلف انداز میں، اس نئیں جی، میں مصروف رہتا۔

مفتی کی اس عادت کا ذکر ایک دفعہ میں نے کشمیر اداس ہے، کے والے محمود ہاشمی سے کیا (ہاشمی مفتی کا شاگرد رہا ہے) وہ بولا کہ سکول ماسٹری کے زمانے میں مفتی سب سے زیادہ خوش پوش آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لڑکے اس کی تقلید کرتے تھے۔ اور دوسرے ماسٹر تنقید۔ یہ بھی ہاشمی سے معلوم ہوا کہ مفتی تھا بہت سخت گیر۔ بہت مارتا تھا لیکن پڑھانے کا طریقہ انوکھا تھا۔ نتیجہ یہ کہ سب لڑکے اس سے ڈرتے تھے۔ درمیانہ قسم کے اور ہوشیار طالب علم اسے بہت پسند کرتے تھے۔ ہاں ازلی نالائق محض ڈرتے تھے۔ اور کوستے تھے۔ مفتی سے جب میں نے ہاشمی کی اس گفتگو کا ذکر کیا تو کہنے لگا۔

ساو نہیں جی۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے، وہ دن ظاہری بناؤ سنگار اور ٹیپ ٹاپ کے تھے۔ اب اگر چہرے کے پالش اور پتلون کی دھار میں کھوئے رہیں تو روح کی چمک اور احساس کی دھار کند ہو جائے گی۔ اور پھر اگر ان جالوں میں رہوں تو۔

آخری فقرے میں منفرد ہونے کی اتنی واضع کوشش تھی کہ مجھے بھی ہنسی آگئی اور اس نے بھی دانت نکال دئے۔ اچھا یہ بات مفتی میں کمال ہے بلکہ اب تو اس کی فطرت کا جزو بن چکی ہے کہ بات ہو یا افسانہ روایت سے بغاوت ضرور کرے گا۔ ایسی بات کہنے میں تو اسے خاص لطف آتا ہے جو غیر متوقع ہو۔ ایک روز ہمارے ایک نیک طبع سے دوست محمد عمر نے مفتی سے گلہ کیا کہ تم جگہ جگہ مجھے بدنام کیوں کر رہے ہو۔

"یار بڑا بے وقوف ہے تو"۔ مفتی صاحب چہکے۔

" ڈڑڑڑ۔ دڑودم" عمر غصے میں ہولتا گیا۔ مطلب یہ تھا کہ !

اس میں بے وقوفی کی کون سی بات ہے۔، سیدھی طرح جواب دو میری بات کا۔

جواب کیا۔ تمہارا خیال ہے میں تمہارا اتناد شمن ہوں کہ تمہاری نیکی کی تشہیر کرتا پھروں۔ اس

میں دشمنی کی کیا بات ہوئی۔

دشمنی نہیں تو اور کیا ہے اگر تمہارے دوستوں کو معلوم ہو گیا کہ تم واقعی نیک ہو تو تمہارا اسارا رعب جاتا رہے گا۔ تمہارا۔ کوئی بات نہیں پوچھے گا اور پھر میری بھی تو سخت بدنامی ہو گی۔

"یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔ بدنامی کیسی"۔

"لوگ نہیں گے کہ مفتی اتنا گھٹیا ہو گیا ہے ایسے یار رہتا ہے جنہیں نیکی کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں"۔

قہقہہ پڑا اور عمر صاحب کا غصہ اور گلہ اس میں دب کر رہ گیا۔

اپنے افسانوں میں بھی انوکھی بات نئے انداز میں کہنے کی دھن میں وہ شعور کے طلسمات میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ کردار تو اس کے یہی عام انسان ہوتے ہیں۔ یہی اسمارائیں، یہی سمیع، یہی آپا جان، یہی بھائی جان، یہی سیدھے سادے واقعات جو ہماری آپ کی دنیا میں ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان عام لوگوں کے عام واقعات میں مفتی وہ پہلو دیکھتا ہے جو ہم آپ نہیں دیکھتے اور وہ انہیں اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ نقطہ نگاہ کا یہ عجب اور اظہار کا انوکھا پن، مفتی کی باتوں کی بھی خصوصیت ہے اور افسانوں کی بھی۔ بیٹھے بٹھائے جب آپ کی بات کو سیدھی سادھی بات کو۔ اونئیں جی، کی کند چھری سے کاٹے تو سمجھ لیجئے کہ میاں ممتاز مفتی بات کا کوئی انوکھا پہلو پیش کرنے کی تمہید کر چکے ہیں۔ ویسے یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کی آپ اس کی بات مانیں یا نہ مانیں۔ اس پر عمل کریں نہ کریں۔ اس کی دلچسپی کے طلسم سے نہیں بچ سکتے۔

اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس کی یہ عجیب باتیں حقیقت کا روپ دھار کے ضرور نظر آئیں گی۔ اس کا ایک افسانہ ہے۔ نام مجھے یاد نہیں۔ شاید آپکو یاد آجائے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک نوجوان لڑکا انور محلے کی ایک نوجوان لڑکی سے عشق کرتا ہے [illegible] کی کھڑکی ملاقات کا ذریعہ بنتی ہے۔ افسانے

میں اس لڑکی کی شادی لڑکے سے ہو جاتی ہے۔ (آج کل تو عام زندگی میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے)ازدواجی زندگی میں تلخیاں آتی ہیں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ سخت سست کہا جاتا ہے۔ بات چیت کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر آدھی رات کے قریب کمرے کی کھڑکی پر آہستہ سے دستک ہوتی ہے۔ لڑکی خوف سے دبلی آواز میں پوچھتی ہے۔ "کون"۔

"میں ہوں انور جذبات بھری آواز آتی ہے"س۔

کھڑکی آہستہ سے کھلتی ہے لڑکا جوتے بغل میں دبائے ڈرا۔سہما ہولے ہولے داخل ہوتا ہے۔ کھڑکی آہستہ سے بند ہو جاتی ہے۔ رات بھر سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ ملبوس سرسراتے ہیں اور اگلے روز پھر سے زندگی کی دھار سکون سے بہنے لگتی ہے۔

بڑی عجیب بات ہے۔ ہے نا۔ عجیب۔ آپ کو مفتی کی کہانیوں اور باتوں میں عموماً ملے گا۔ یہ عجیب ہی مفتی ہے۔ ویسے اس سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ سنادوں۔ میرے اپنے ایک دوست نے سچ مچ ایسی ہی ایک کھڑکی بنا رکھی ہے۔ یہ کھڑکی ہے اپنی ہی بیوی سے ٹیلیفون پر عشق و محبت کی باتیں اور کسی ریستوران میں ملنے اور چائے پینے کے وعدے وعید۔ شادی کو تیرہ برس ہو چکے ہیں تین بچے بھی ہیں۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ آپ بھی نہ کیجئے، جب تک کوئی ایسا ہی واقعہ آپ کے ساتھ یا آپ کے دوستوں کے نام نہ ہو گزرے۔ آپ خاطر جمع رکھئے کہ ایسا واقعہ ہو گا ضرور میں نے کہا تا کہ حقیقتوں نے مفتی کی عجیب باتیں سچ کر دکھانے کے لئے اس سے سازش کر رکھی ہے۔

مفتی کی افسانہ نگاری کی ابتداء کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ انگریزی کا اچھا ماہر بنتا ہے لیکن اردو جاننے کا اس کا بالکل دعویٰ نہیں، یہ واقعہ ۱۹۳۵ کا ہے محمود ہاشمی نے ہی بتایا تھا۔ آدمی گپ باز ہے اس لئے آپ کو سنانے سے پہلے میں نے اس کی تصدیق مفتی سے کر لی ہے۔ ملتان میں مفتی سکول ماسٹر تھا اور وہیں ایک اور ماسٹر صاحب ایک رسالہ نخلستان کی ادارت کرتے تھے۔ وہ چھٹی پر گئے تو راشد سے رسالے کے لئے کام کرنے کے لئے کہہ گئے۔

سواد کچھ کم تھا۔ راشد نے مفتی سے کوئی انگریزی مضمون ترجمہ کرنے کے لئے

کہا۔ مفتی صاحب نے ایک مزاحیہ مضمون انگریزی میں لکھا اور پھر راشد کے ارشاد کے مطابق اس انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ایک ہندستانی فلم .اچھوتی دلہن۔ پر طنزیہ مضمون تھا۔، راشد نے مضمون پسند کیا۔ ہاشمی کہتا ہے کہ اس مضمون کا اتنا چرچا ہوا کہ جب مفتی نے افسانہ نگاری شروع کی تو پہلا افسانہ نخلستان کو ہی بھیجا۔ کچھ تعریفی خطوط بھی آئے۔ مزید لکھنے کی فرمائش ہوئی اس دفعہ ترجمے کی بخ نہیں تھی۔ اس نے اردو میں کہانی لکھی گئی اور ادبی دنیا کے سالنامے میں چھپی۔ یہیں سے مفتی کی افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی جو آج کل ستائیس سال بعد بھی عروج پر ہے۔ اس شہرت بلکہ دھاک کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو زبان و بیان کا خدایا فن کا دیوتا نہیں گردانتا۔ اردو بولنے والوں کے ساتھ بھی پنجابی میں بات کرتا ہے۔ کہتا ہے مجھے زبان پر قدرت نہیں اور یہ کہنے کے باوجود اظہار کے لطیف اور نازک پہلو پیش کرتا ہے۔ اس کا انداز اس قدر منفرد ہے کہ کسی افسانے سے بھی ایک ٹکڑا اٹھا کر پڑھ دیجئے۔ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے گا کہ مفتی کا ہے۔ اردو کے شاعروں اور مزاح نگاروں میں تو چند باکمالوں کو اسلوب کی یہ انفرادیت حاصل ہے۔ لیکن افسانہ نگاروں میں مفتی کے سوا کسی کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔

اگر شیخ اجمل کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی۔ اگر خدا بخش کو ممدو کبابئے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی۔ اگر اسلم کو مس رنگی کی محبت کا عارضہ اور مجھے چغتائی خطوط کا جنون نہ ہوتا۔ تو یہ آپ بیتی کبھی معرض وجود میں نہ آتی۔

اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لئے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑتا۔ اور پھر جمیل اسلم خدا بخش اور میرے علاوہ ربڑ کی گڑیا کی طرح چیختی ہوئی بڑھیا۔ اس کی پوتی بینا جسے فطرت نے چغتائی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا اور بالآخر ہمارا انوکر بدھو جو برائے نام بدھو نہ تھا۔

اے ہے لڑکی سر پر دوپٹہ لے لے ربڑ کی گڑیا چیختی اور ہمیں شدت سے اس بات کا احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک لڑکی موجود ہے جس کے سر سے ریشمی آنچل پھسل پھسل جاتا ہے۔

"اے ہے مینا سنبھل کے بیٹھ۔ تجھے اپنا ہوش بھی نہیں" اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ لڑکی عمر کے اس حصے سے گزر رہی ہے جب اپنا ہوش نہیں ہوتا۔ وہ ربڑ کی گڑیا چینچی اور جمیل خواہ مخواہ شرماتا۔ اسلم کے دل میں رنگی کی یاد تازہ ہو جاتی خدا بخش کرتہ بند جھاڑ کر کہتا۔ یار بڑا گرم مصالحے ڈالنے لگا ہے۔ ممدو کبابوں میں۔ گرمی ہو گئی ہے کچھ اور میرے دل میں مینابدوش کا عمل ابھرتا (اوئی اللہ)

دیکھا آپ نے کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یہ تحریر کہیں دیکھیں اور نہ پہچان پائیں کہ یہ ممتاز مفتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ خاکستری ہوتے ہوئے بال دھنسی ہوئی آنکھیں۔ جھریوں والا لمبوترا چہرہ اور شکنوں بھرے لباس والے سکوٹر سوار کو دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں کہ یہ ممتاز مفتی ہے۔ پچھلے دنوں اس نے ایک افسانہ " بیسن بازار" اس پر لکھا۔

بیسن بازار سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اسے بیسن سے تعلق ہے اگرچہ وہاں بیسن کے سموسے بنتے ہیں اور شہر بھر میں مشہور ہیں۔ لیکن اس بازار کا نام بے سن تھا۔ جو بگڑ کر بیسن ہو گیا۔

بیسن بازار کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ خرید و فروخت کی گہما گہمی کے باوجود جو وہاں سرِ شام سے دیکھنے میں آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خریدار کی خرید سے کوئی دلچسپی نہیں اور دکاندار فروخت کی تگ ودو سے بے نیاز ہیں۔ وہاں کے دکاندار کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بذاتِ خود خریدار ہو۔ گاہک کی توجہ اس شے پر مرکوز نہیں رہتی، جسے وہ خرید رہا ہوتا ہے۔ وہاں کے بھکاریوں میں ایک احساس فراغت ہوتا ہے۔ وہاں کے مزدوروں کی پھٹی ٹوپی سر پر اس انداز سے دھری ہوتی ہے جیسے کسی نواب کا کلا ہو۔

وہاں کے کمسن آوارہ لڑکوں کی آنکھ میں بلوغت کی چمک ہوتی ہے چلتے پھرتے سپاہیوں کی چال ڈھال سے فرائض نہیں بلکہ حقوق کی جھلک مترشح ہوتی ہے وہاں نوجوان آرزو کرتے ہیں کہ پختہ کار ہوتے۔ اور پختہ کار خواہش کرتے ہیں کہ جوان ہوتے۔ بوڑھے

وہاں لاحول پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ "بیسن بازار" میرے تجربے میں مفتی پہلا افسانہ نگار ہے جو ہر قابلِ گرفت بات حرف گیری سے بچ کر کہہ جاتا ہے۔ جب منٹو پر عریانی کے الزام میں مقدمہ چلا تو مفتی کو بہت غصہ آیا۔ بولا۔

میں مضمون لکھ رہا ہوں۔

کس بات پر۔ میں نے پوچھا۔

بات کیا یار مسعود ادب کے معاملے میں یہ حکومت بھی کمال ہے۔ بھائی آخر کیا ہو گیا جو دو لفظ لکھ دیئے۔ اس نے۔ خواہ مخواہ کی مقدمے بازی۔

یہ کس کی حمائت میں تقریر شروع کی ہوئی ہے۔

او نئیں جی، حمائت وماِئت نہیں۔ وہ حرامی جو ہے سو ہے۔ لیکن انہیں بھی تو دیکھو۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اپنے درزیوں کے خلاف مقدمہ نہیں چلاتے جن کی ساری دکانداری ہی اس بات پر ہے کہ لباس کے ایسے ڈیزائن نکالیں جس سے عورت کی ہر چھپانے کی چیز چھپ کر نمایاں تر ہو جائے۔ تاجروں پر کیوں مقدمے نہیں چلتے۔ یہ من کی پیاس۔ آنکھ کا نشہ اور تیری میری مرضی کیا نام ہوئے کپڑوں کے۔ ان کی تو سرپرستی ہو گئی۔ اور جہاں ادیب نے کوئی بات کہی مقدمے بازی شروع ہو گئی۔ واحیات بات ہے یار۔

لیکن یہ منٹو بھی تو باز نہیں آتا بھئی۔ کیا ضروری ہے کہ دو چار فقرے ایسے ضرور لکھے جائیں کہ گرفت ہو سکے۔

اب اپنے افسانوں میں دیکھو جنسیات کے علاوہ ان میں ہوتا ہی کیا ہے لیکن کبھی مقدمہ نہیں چلا تم پر میں نے لقمہ دیا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک افسانہ لکھوں گا جس میں جنسی محبت اپنی قبیح ترین غیر فطری صورت میں موجود ہو گی۔ لیکن مقدمہ نہیں چلے گا اور معلوم ہے آپ کو کون سا افسانہ لکھا گیا۔ "لئی کا پل"۔

ہے بڑا ریاکار۔ عام انسانوں کی طرح محبت بھی کرتا ہے نفرت بھی کرتا ہے۔ دوستی بھی دشمنی بھی لیکن چونکہ عام انسان کہلانا نہیں چاہتا اس لئے ان کو چھپاتا رہتا ہے اور ان پر

اپنے انوکھے انداز کے نظر وفریب کے پردے ڈالتا رہتا ہے۔ وہ تو ہے مبالغہ آمیز سچ۔ سچ سے اس قدر مبالغے سے کام لے گا کہ دوسرا اسے قطعی جھوٹ سمجھ کر گمراہ ہو جائے اور وہ بنیادی سچ جس کے اظہار سے مفتی شرماتا ہے۔ محفوظ ہو جائے۔ اور اس کی بہت کم باتوں پر یقین ہے آپ بھی نہ کریں تو سکھی رہیں گے۔ ایک دوست کا واقعہ ہے کہ وہ بزم ناو نوش سے فارغ ہو کر رات کے وقت گھر گیا خیال تھا بیوی سوئی ہوئی ہو گی نوکر دروازہ کھولے گا لیکن دروازہ کھلا تھا اور بیوی کھڑی تھی۔ لمحے بھر کو ٹھٹھکا۔ پھر منہ اس کے قریب لے جا کر بدبو کا بھبکا اس پر پھینکا اور کہنے لگا ذرا دیکھ شراب پی کر آ رہا ہوں۔ وہ بے چاری اس گناہ کے یوں کھلے بندوں اعتراف کو کیسے مان لیتی۔ ہنس دی کہ یہ تو الائچیوں کی خوشبو ہے خواہ مخواہ مجھے چھیڑ رہے ہیں اور اس کے بعد اس کی شراب نوشی پر ہمیشہ کے لئے الائچیوں کا پردہ پڑ گیا۔ یہی حال مفتی کے سچ کا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ اگر واقعی کسی کو چاہتا ہے تو پندرہ سال کے بچے کی طرح۔ اس جذبے اور اس کے اظہار سے ڈرے شرمائے گا۔ اس کا علاج یہ ہو گا کہ اس سے اس کے واقفوں، ملنے والوں سب سے کہتا پھرے گا کہ مجھے تو اس سے عشق ہو گیا ہے اور یوں اس طرز کی مبالغہ آمیز تشہیر کر کے اسے محفوظ کر لے گا۔ محمد حسین ڈرامہ آرٹسٹ سے لگاؤ ہوا تو اسے اول درجے کا الو کا پٹھہ کہہ کر اس کا مذاق اڑائے گا۔

ان سب چالاکیوں، بد معاشیوں، بے رحمیوں کے باوجود اس میں انسانیت کا عنصر غالب ہے۔ خود ہی کہا کرتا ہے کہ انسان میں باقی تمام جذبات کے مقابلے میں انسانیت کا عنصر زیادہ نہ ہوتا تو دنیا ختم ہو چکی ہوتی۔ انسانیت سے لبریز دل رکھتا ہے اور اس سے شرماتا ہے، گھبراتا ہے۔ اسے ہر ممکن ذریعہ سے چھپاتا ہے۔

لاشعور کی کریہہ حقیقتوں کو اچھال کر، سچ میں مبالغہ کر کے۔ جھوٹ اور سچ کی چابک دست آمیزش اور اوہ نہیں جی ایہہ گل نہیں، کے مسلسل استعمال سے۔ لیکن یہ انسانیت اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اجاگر ہونے سے بھی باز نہیں آتی۔ افسانوں میں، باتوں میں، بے چارہ مفتی۔

سورما

(احمد بشیر)

ممتاز مفتی کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ آپ کسی سکول میں چلے جائیں جہاں وہ پڑھاتا رہا ہے اور اس کے متعلق پوچھیں تو شاگرد کہیں گے "ان کی باتیں؟ کیا بات ہے ان کی باتوں کی مگر ان کا ڈنڈا۔۔۔ توبہ ہے!!" اساتذہ مسکرا دیں گے۔ "ہاں تھا تو یار آدمی مگر عجیب سا تھا"۔ ہیڈ ماسٹر اطمینان بھرا سانس لے گا۔ "خیر اب تو یہاں سے چلا گیا ہے، خیر چھوڑیئے اس بات کو"۔ آل انڈیا ریڈیو کے کسی رکن سے پوچھئے۔ "وہ شخص؟ خصوصیت تو خیر۔۔۔ ویسے خوب آدمی ہے، اچھا ہی ہے میرا مطلب ہے آپ سمجھتے ہی ہیں نا۔ "مکتبہ اردو" میں بات چھیڑیئے، ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جائے گی۔ ممتاز مفتی؟ ممتاز مفتی، ممتاز مفتی ہی ہے۔ ہاں ذرا پیسوں کے معاملے میں۔ لیکن خیر، حاجت مند کون نہیں"۔ اس کے والد سے بات کیجئے۔ ایک ساعت کیلئے وہ خاموش ہو جائیں گے۔ پھر حقے کا لمبا کش لے کر کہیں گے۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہاں اگر وہ اتنا خود سر نہ ہوتا اور عقل سے کام لے سکتا تو اس کی زندگی سنور ہی جاتی"۔ اس کی پہلی بیوی سے بات کی جاتی تو وہ ہنس دیتی۔ "اچھا! تو آپ انہیں کچھ سمجھتے ہیں"؟ اور دوسری بیوی سے پوچھئے تو وہ ہونٹ پر انگلی رکھ لے گی "ان کی بات کر رہے ہیں آپ؟ ان کی کیا بات ہے"!

ممتاز مفتی بچپن اور سنجیدگی کا امتزاج ہے، چھوٹے قد کا مخنی آدمی لمبوترا چہرہ، گدلی گدلی بے جان آنکھیں اور بڑا سا سر۔ بات کیجئے تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ "ارے! یہ تو

محض جی حضور ہے۔ ہوں! تو یہ ہے ممتاز مفتی! احساس برتری کی ایک لہر آپ کی رگ و پے میں دوڑ جائے گی۔ چھاتی قدرے باہر کو اینٹھ آئے گی۔

کسی موضوع پر چاہے وہ کتنا ہی مضحکہ خیز ہو۔ اس کی رائے دریافت کیجئے تو نہایت خلوص اور دیانت داری سے آپ کی ہاں میں ہاں ملا دے گا۔ اس کی موجودگی میں کسی معاملے پر بحث کر دیکھئے۔ چپکا بیٹھا سنتا رہے گا۔ اس سے استفسار کیجئے تو آپ کی ہنسی نکل جائے گی۔ کیونکہ وہ آپ سے اور آپ کے مخالف کے ساتھ بیک وقت اتفاق کر رہا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ نکتہ متنازعہ فیہ آپ کی حیرانی اور ہنسی کے درمیان کہیں کھو جائے گا۔ اگر آپ ذرا سنجیدہ قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں تو آپ کو غصہ آنے لگے گا یا آپ اسے مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔

ممتاز مفتی کو آپ اس روپ میں صرف اسی صورت دیکھیں گے جبکہ آپ کی اس سے محض رسمی ملاقات ہو۔ لیکن اگر آپ اس کے دوست ہیں، پناہ بخدا۔ کاش کہ میں اور ممتاز مفتی محض شناسا ہوتے، دوست نہیں۔

جب میں اس سے پہلی مرتبہ ملا تو وہ چارپائی پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ رسمی تعارف کے بعد اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ "مزاج اچھے ہیں؟ تشریف رکھیئے"۔ اور پھر سے طبلہ بجانے میں منہمک ہو گیا۔ یہ ہے ممتاز مفتی؟ میں نے سوچا۔ اب اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی شائد مجھ سے اس ان کہے فقرے کا انتقام لے رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں سے حقیقی ممتاز مفتی کونسا ہے۔ وہ جو کچھ سال پیشتر مجھ سے متعارف ہوا تھا اور مہینوں محض واقف کار کی حیثیت سے ملتا رہا یا یہ جو اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے اور دوستی کا دم بھر رہا ہے۔

دوستی کی ابتدا میں وہ آپ کی شخصیت میں انوکھے گن دیکھے گا اور ان کا آپ سے بے تکلف اظہار کرے گا۔ ایسے انوکھے گن جن کے وجود کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ آپ سمجھیں گے کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ لیکن اثر قبول کئے بغیر اس کی

باتوں کے رنگین جال سے نکل جانا کچھ آسان کام نہیں۔ اس کی دلیل کا رنگ عجیب ہوتا ہے "بے تعلق، بے تکلفی اور سرسرا ہے"۔ اس کی گفتگو کی تین خصوصیات ہیں۔ بظاہر وہ آپ کی شخصیت کی کسی خامی کے بارے میں بات کرے گا۔ لیکن بات کی تہہ میں آپ کی شخصیت کی کسی انوکھی خوبی کی طرف اشارہ ہوگا اور اس رنگین اشارہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خوبی کے انوکھے پن اور منفرد نقطہ نگاہ کی شگفتگی کی وجہ سے آپ حیران رہ جائیں گے۔ وہ نیا گن نہ جانے کہاں سے چپکے چپکے آپ کی شخصیت میں ابھر آئے گا۔ کچھ دیر بعد آپ کو اپنے اندر اتنے نئے گن محسوس ہونے لگیں گے کہ آپ اپنے کردار کے انوکھے پن پر ششدر رہ جائیں گے۔

آپ یہ دیکھ کر متعجب ہوں گے کہ آپ کوئی عجیب ترین شخصیت ہیں۔ چنانچہ آپ کے اندر ایک نیا کردار بیدار ہو جائے گا۔ جب یہ نیا کردار آپ کے معمولات پر چھا جائے گا تو مفتی دفعتاً آپ کی کمزوریاں دکھانے لگے گا۔ آپ کی ہر بات کا تجزیہ کرے گا اور آپ کی شخصیت کے کھوکھلے پہلوؤں کو اس شدت سے ریزہ ریزہ کر دے گا کہ نئی شخصیت استوار ہونا تو کجا آپ کی پہلی شخصیت بھی کچی دیوار کی طرح بیٹھتی ہوئی محسوس ہوگی اور آپ کے اندر ایک بے پناہ اور لا محدود خلا پیدا ہو جائے گا۔ آپ اس انمٹ خلا کو تجسس سے پُر کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر اس سے الجھنوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ آپ چاہیں گے کہ اس کی پھینکی ہوئی کمند کو اتار پھینکیں۔ اس کی باتوں کو بے وقعت بنا دیں۔ جی چاہے گا کہ آپ اس سے کہیں دور بھاگ جائیں۔ مگر آپ بے حس ہو چکے ہوں گے۔ آپ اس کی باتوں کو نہ سننے کی کوشش کریں گے ان کا مذاق اڑانا چاہیں گے۔ مگر اس کی باتیں زبردستی آپ کے اندر قیام کر چکی ہوں گی۔ آپ پر چھا چکی ہوں گی۔ آپ بے حد مظلوم اور مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوگی کہ اس کا یہ نیا رخ آپ کو اور بھی متاثر کر دے گا۔ آپ کے دل میں اس کیلئے ایک خاص جگہ پیدا ہو جائے گی اور آپ پھر اس کی طرف بھاگنا چاہیں گے۔ آپ کا جی چاہے گا کہ آپ پر یہ ظلم ہوتا رہے اور بھی۔ اور بھی۔

ممتاز مفتی ایک حالتیں بدلنے والا کیڑہ ہے۔ میں گرگٹ کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے پہل تو وہ آپ کو محض ایک کویا سا نظر آتا ہے۔ پھر محسوس کرتے ہیں کہ وہ کیڑے کی طرح رینگ رہا ہے اور آنکھ کے جھپکے میں آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک پھدکتا ہوا سنپولیا بن کر آپ کے گرد منڈلا رہا ہے۔ انہی عجیب کیفیتوں کی وجہ سے اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات بہت مختلف اور دلچسپ ہیں۔

آپ مفتی سے اس کے اپنے بارے میں دریافت کریں تو وہ کندھے سکوڑ کر کہے گا
''اوہ! میں؟ یعنی۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ میرے بارے میں پریشان کیوں ہوتے ہیں''؟
لیکن اگر آپ اس کی ڈائری دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے بارے میں واقعی پریشان ہوتا رہا ہے۔ اس کی ڈائری کا ایک ورق ملاحظہ ہو:

''سندھ باد جہازی کی طرح میرے کندھوں پر بچپن کا بڈھا سوار ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگ اس بھید سے واقف ہو چکے ہیں اور مجھ پر ہنستے ہیں۔ مدت تک میں کوشاں رہا کہ لوگ مجھے ایک سنجیدہ آدمی سمجھیں اور مناسب اہمیت دیں۔ اس مسلسل کوشش کا صرف یہی نتیجہ ہوا کہ میرے ماتھے پر ایک تیوری سی ابھر آئی، اور اب میں اسے مٹانے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہوں۔

میری طبعیت بے ہنگم، بے لگام اور بے صبر ہے۔ اس میں روانی نہیں، نظم نہیں، ضبط نہیں۔ میری طبعیت میں بنیادی طور پر جو جذبہ کار فرما ہے وہ جھجھک اور کمتری ہے۔ مجھ میں باقاعدہ چلنے کی اہلیت نہیں۔ ہاں کبھی کبھی بدک کر بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں۔

میری شخصیت پر عورت کا عنصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے۔ اگر میرا ذہن ایک پکی سڑک ہے تو دل ایک الجھی ہوئی پگڈنڈی۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ جس کی وجہ سے میری طبعیت میں توازن نہیں۔ ربط نہیں، سکون نہیں۔ ہر گھڑی ایک کش مکش سی رہتی ہے۔

میں بے حد ڈرپوک ہوں اور بسا اوقات اس خوف سے کہ میرا پول نہ کھل جائے

احتقانہ دلیری کے کام کر دکھاتا ہوں۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں اور اسی لئے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔ دل ہی دل میں دنیا سے از حد خائف ہوں اور اس بات پر مجھے اپنے اوپر غصہ آتا ہے۔ چنانچہ میں قطعی بے پرواہ ہو کر دنیاداری کو انتقاماً ایک عظیم گناہ سمجھتا ہوں۔ بلندیوں سے اس قدر ڈرتا ہوں کہ اگر مجھے کسی اونچی چٹان پر بٹھا دیا جائے تو میں اس ڈر سے بچنے کیلئے کہ گر نہ پڑوں اپنے آپ کو نیچے گرا دوں گا۔ عورت سے ڈرتا ہوں اس لئے اس کی طرف کھنچا جاتا ہوں۔ عشق ہو جائے تو محبوب کو ملنے کی بجائے میری خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دوں۔ میری محبت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیوں پر چلتی ہے۔ محبوبہ کے نقاب کا ہر تار مجھے ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے کنواری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی نیار کی ایک مستغنی نظر پر دوشیزگی، نوخیزی، معصومیت اور الھڑپن تج دینے کو تیار ہوں۔ مجھے بد معاش عورت سے عشق ہے۔

''میرا ذہن قومی، مذہبی، خاندانی اور رسمی تعصبات سے خالی ہے۔ میں عزت اور خودداری کے جذبات سے قطعی کورا ہوں''۔ (ممتاز مفتی)

اگرچہ آج کا ممتاز مفتی کل کے ممتاز مفتی سے مختلف ہے لیکن بنیادی طور پر بالکل وہی ہے۔ بچپن میں وہ سوتیلی ماؤں کے زیر سایہ رہا۔ چنانچہ اس نے عمر کا پہلا حصہ اس غصے کے خلاف جہاد کرنے میں گذارا جو اس کے دل میں کثرت ازدواج کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس ماحول میں بچپن گذارنے کی وجہ سے اس کی طبعیت میں ڈر اور شدت پیدا ہو گئی اور ان دونوں جذبوں پر اس کی شخصیت کی بنیاد رکھی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے حد شرمیلا اور چپ چاپ ہو گیا جس سے اس کی کالج کی زندگی برباد ہوئی۔ یہ زمانہ اس نے ایلوڈی مانٹی اور پیڈرو بہادر کی خاموش فلمیں دیکھ کر، سستے سگریٹ پی کر، مونگ پھلی کھا کر اور کالج سے بھاگ کر گذارا۔ زندگی کا دوسرا حصہ اس نے ایک عورت کے اثر سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش میں کاٹا۔ اور زندگی کی تیسری منزل افلاس کے خلاف لڑنے میں بسر کی۔ کیونکہ اسے ۴۵ روپے کی حقیر رقم میں آٹھ پیٹ پالنے پڑتے تھے۔ اور اب وہ زندگی میں پہلی بار مطمئن ہے۔

ممتاز مفتی مجلسی آدمی نہیں۔ وہ کسی کو ملنے سے ہچکچاتا ہے اسے گھر بیٹھے رہنے کا بے حد شوق ہے۔ اگر آپ اسے کچھ کتابیں، چائے، پان، کچھ کھانے کو، کبھی کبھار کوئی آدمی بات کرنے کو یا ایک ریڈیو سیٹ دے کر ایک جگہ مقید کر دیں تو اسے بہت دیر تک پتہ ہی نہ چلے گا کہ وہ مقید ہے۔ اس کے برعکس اگر اسے کسی ایسی جگہ رکھیں جہاں بہت سے آدمی اور ہنگامے ہوں تو وہ گھبرا کر کہیں بھاگ جائے گا۔

گھر کا شوقین ہونے کے باوجود وہ فرمانبردار خاوند اور گھریلو مرد نہیں۔ ممتاز مفتی وقت کے احساس سے قطعی آزاد ہے۔ اس کا کلاک کبھی ٹھیک وقت نہیں دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ مشینری ہمیشہ اپنے چلانے والے کی ذہنیت کے مطابق خصوصیات پیدا کر لیتی ہے۔ بہت ہوا، کسی نے اس کے کلاک میں کوک بھر دی تو عموماً صبح دس بجے سوئیاں ٹھیک دس پر ہی ہوں تو یقین رکھیں کہ گھڑی پر رات کے دس بج رہے ہیں صبح کے نہیں۔ مقولہ ہے کہ شہر اس مقام کو کہتے ہیں جہاں لوگوں کو روپے کی قیمت کا اندازہ نہ رہے۔ اس لحاظ سے ممتاز مفتی مستقل طور پر شہر میں رہتا ہے اسے فضول خرچی میں بڑی تسکین ملتی ہے۔ خصوصاً جب اس کا ہاتھ تنگ ہو تو تسکین کی خواہش اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ زندگی بھر قرض ہی اس کی پونجی رہی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے ادھار کا انتظام کر ہی لیتا ہے۔ آپ نے کیسا ہی عزم کیا ہو کہ آپ اسے کچھ نہ دیں گے مگر وہ آپ سے مانگے گا ہی کچھ ایسے انداز میں کہ آپ اپنے سارے ارادوں کو یکسر بھول جائیں گے۔ خوش قسمتی سے اس میں خودداری نام کو بھی نہیں اور اسی سے وہ اپنی صدابہار غربت اور بدنامی کے قبیح نتائج سے بچا ہوا ہے۔۔۔ وہ خودداری کو ایک بہت بڑی خوبی سمجھتا ہے مگر اس کا خیال ہے کہ خودداری کا نہ ہونا بھی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

دفتر جاتے ہوئے اسے اکثر خیال آتا ہے کہ چپڑاسیوں کو سلام کرنے کی عادت اچھی نہیں۔ اسے اپنی اس کمزوری پر غصہ آنے لگتا ہے اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ آج چپڑاسیوں کو سلام نہیں کرے گا اور ان کے سلام کے جواب میں صرف سر ہلا دے گا جیسا کہ ایک خوددار آدمی کو کرنا چاہیے۔ لیکن موقعہ آنے پر اس کا ہاتھ خود بخود اٹھ جائے گا۔ "آداب عرض"۔

اگر اس کا افسر اس سے کہے "دیکھیے صاحب آپ نہیں سمجھتے" تو سوچے سمجھے بغیر اس کے منہ سے نکل جائے گا "جی ہاں، جی ہاں"۔ پھر ملاقات کے بعد دفعتاً اسے احساس ہوگا کہ چاہے وہ افسر ہے لیکن اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ "میں نہیں سمجھتا، میں"۔

وہ اپنی حماقتوں کا اعلانیہ اظہار کرنے سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بلکہ اسے اپنی کئی ایک حماقتوں پر ناز ہے۔ وہ دوستی، محبت، ایثار اور قربانی کو حماقتیں سمجھتا ہے اور عام آدمی کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں عوام ذہین آدمیوں سے بہتر مخلوق ہیں۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ذہنی قابلیت حاصل ہونے سے انسانیت کی خوبی کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ علم کو انحراف سمجھتا ہے اور جذبہ کو صراط مستقیم۔ اس کی رائے میں زندگی کی تمام تر دلچسپی، رنگینی اور خوشی عوام کے دم قدم کا نتیجہ ہے۔

ممتاز مفتی حتی الوسع جھوٹ نہیں بولتا۔ مگر یہ خوبی عمدہ اخلاق کا نتیجہ نہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک جھوٹ یا سچ بولنے کا عمدہ اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ جھوٹ بولنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب لوگوں کا ڈر غالب ہو یا یہ خوف ہو کہ مخاطب میں سچائی برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ چنانچہ ممتاز مفتی محض آپ کے جذبات اور احساسات کے احترام اور اخلاق کی خاطر جھوٹ بولنا گوارا کرے گا اور جھوٹ بول کر آپ کی ذات پر بہت بڑا احسان کرے گا۔ چونکہ ابتداً وہ لوگوں سے بے حد خائف تھا اس لئے اپنی جان بچانے کیلئے جھوٹ بولنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ مگر اب وہ جان گیا ہے کہ پھٹ سے سچ بول دینا لوگوں کو دھوکا دینے کا کامیاب ترین ذریعہ ہے۔ اس میں رازداری کی اہلیت بے شک ہے۔ مگر وہ اس اہلیت کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ آپ اسے کسی بات کے راز میں رکھنے کی تاکید کر دیں وہ بات اس کے سر پر سوار ہو جائے گی۔ دل پر بوجھ سا بن جائے گی۔ حتیٰ کہ وہ راز فاش کر دینے پر مجبور ہو جائے گا تاکہ اسے سکون مل سکے۔ اگر یہ بات آپ کی ناموس کے متعلق ہے

اور اس کا راز میں رہنا ضروری ہے۔ تو وہ کسی کو اعلانیہ تو نہیں بتائے گا مگر چھپا کر بھی نہیں رکھ سکے گا۔ اس لئے وہ اسے یکسر بھول جائے گا تاکہ اسے چھپانے کی زحمت سے چھوٹ جائے۔

وہ ذہنی الجھنوں سے بہت ڈرتا ہے۔ اگر اسے بتایا جائے کہ وہ نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے تو وہ ایک لمحہ کیلئے پریشان ہو جائے گا مگر فوراً ہی اپنے آپ کو اس مشکل کیلئے تیار کر لے گا اور اس طرح اپنی زندگی سے الجھن اور غم کو مٹا دے گا۔ تھوڑے ہی وقفہ میں وہ اس تبدیلی کیلئے اس قدر تیار ہو چکا ہوگا کہ اگر دوبارہ اطلاع پہنچے کہ وہ بحال کر دیا گیا ہے تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ اور اسے اپنی نئی سکیموں کے ضائع چلے جانے کا بہت دکھ ہوگا۔

اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے حادثے پر بھی سناٹے میں نہیں آتا۔ عزیز ترین دوست کی موت پر بھی اسے دھکا نہیں پہنچتا۔ ایسی خبر سن کر وہ خالی الذہن ہو جائے گا اور اس کے برتاؤ سے مترشح ہوگا کہ وہ غمزدہ نہیں بلکہ کھویا سا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے غم اس کے احساسات میں سرائیت کرے گا۔ قطرہ قطرہ ہو کر۔ اچانک اور فوری خوشی پر بھی اس کا طبعی توازن قائم رہتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے گرد تسکین و اطمینان کا ایک خول سا بنا رکھا ہے۔

وہ زیادہ بلند اُمیدیں اور توقعات استوار نہیں کرتا تاکہ پوری نہ ہونے پر اسے دکھ نہ پہنچے۔ کوئی مسرور کن توقع ہو تو وہ اسے بھلا دے گا۔ بھول نہ سکے تو زیادہ اہمیت نہیں دے گا اور دل ہی دل میں امید رچائے رہے گا کہ وہ پوری ہو کر اسے ایک اچانک اور خوشگوار تعجب بخشے اور اگر وہ پوری نہ ہو تو مایوسی کے صدمے سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔

اسے سپنے دیکھنے کی عادت ہے۔ عام طور پر جب اسے سائیکل پر کہیں دور جانا ہو تو راستے کی تھکان سے بچنے کیلئے کسی سپنے میں کھو جائے گا۔ جوانی کے زمانے میں وہ کرائیڈن سے کراچی تک ہوائی تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا کرتا تھا۔ جب وہ ہوابازی سے سیر ہو گیا تو دنیا کا مشہور کرکٹ باؤلر بن گیا اور بسا اوقات ایم سی سی کی ساری ساری ٹیم تینتیس رنوں میں آؤٹ کر لی۔ یہ گیند پھینکنے کا شغل بھی کچھ زیادہ دیر تک دلچسپ نہ رہ سکا۔ اس لئے اس نے دیپک راگ کی صحیح بندش کھوج نکالی۔ وہ مجمعوں میں اس راگ کا الاپ کیا کرتا۔ دیپک کی جاتی ہوئی تانوں سے اہلِ محفل کے دل سلگ جاتے۔ بتیاں جل جل اٹھتیں اور لوگ حیرانی سے بت بنے تکتے رہتے۔ آج کل اس کے خواب بین الاقوامیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے ایسی عجیب شعاعیں ایجاد کر رکھی ہیں جن کی مدد سے وہ بارود کو پھٹنے سے روک سکتا ہے اور ان شعاعوں کی مدد سے وہ آج کل دنیا کے امن کو محفوظ کر رہا ہے مگر ان سپنوں میں اس نے کبھی روپے اور حکومت کے حصول کا پروگرام نہیں بنایا۔ اگرچہ اسے یہ بھی پسند ہے کہ خرچ کرنے کیلئے اسے روپیہ مل جائے لیکن اگر اس کے پاس بہت سا روپیہ آ جائے تو اس کی زندگی کا آدھا لطف ختم ہو جائے گا۔ آج کل اس کی صرف یہی آرزو ہے کہ اس کے پاس ایک ریڈیو سیٹ ہو، کار یا بنگلے کا مالک ہونے کی خواہش اس میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے آپ کو بڑا آدمی یا حاکم تصور کرنا اسے قطعی پسند نہیں۔ چند ایک امیرانہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا بشرطیکہ اس کی موجودہ حالت جوں کی توں رہے۔ اس کی موجودہ زندگی بے پروائی اور مفلسی کا امتزاج ہے۔ عمر بھر اس کے سامان میں ایک چٹائی، ایک بستر، ایک ٹرنک اور دو ایک کرسیاں شامل رہیں اس کے گھر اور کردار کی سب سے بڑی خصوصیت بے ترتیبی ہے۔

سٹرانگ چائے پی پی کر اسے بار بار پیشاب کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس شکایت سے عاجز آ کر ایک دفعہ اس نے ایک مشہور و معروف ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے ملنے کیلئے دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ بیماری اس قدر پرانی ہے کہ اسے اس کی ابتدا کی ماہیت کے متعلق کچھ یاد نہیں رہا اور اب وہ اس کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر جو بیک وقت معالج، فلسفی اور درویش تھا یہ سن کر خوب ہنسا اور کہنے لگا کہ پھر علاج کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مفتی ڈاکٹر کی بات سے اس قدر متاثر اور محظوظ ہوا کہ دوائی لیے بغیر ہی لوٹ آیا۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی بھول کر بھی علاج کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کی زندگی کا زیادہ وقت چیزیں ڈھونڈنے میں گذرا۔ مثلاً پنسل بنانے کیلئے وہ چاقو کی تلاش کرے گا۔ اور اس تلاش کے دوران میں قطعی بھول جائے گا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے۔ بلفرض محال چاقو اس کے ہاتھ آجائے تو اس کی پنسل گم ہو جائے گی۔ وہ اس پنسل کو ڈھونڈنے میں کھو جائے گا۔ جوان جانے میں اس نے کان پر اٹکالی تھی۔ گھر میں اسے ننگے پاؤں، ان دھلے منہ اور بالوں کے گنجل بکھرائے پریشان پھرتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ آپ اس سے بخل گیر ہو کر رو پڑیں۔

کام کرنے بیٹھتا ہے تو اس کا سارا وقت ادھر اُدھر کی معمولی ضروریات کو پورا کرنے میں کٹتا ہے اور کام ایک ضمنی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ چند ہی سطریں لکھ کر وہ پانی کا گلاس پیتا ہے اور پھر پان کھاتا ہے۔ پھر پیشاب کرتا ہے اور پھر پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک گھنٹے میں بیس سطریں لکھتا ہے چار گلاس پانی پیتا ہے دو پان چباتا ہے دو دفعہ پیشاب کرتا ہے۔ اکثر دو ایک سگریٹ بھی پی لے تو مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود اگر اس کی بیوی اس چارپائی پر گڈمڈ شخص سے جو ہر وقت اس سے پانی، پان، سگریٹ ایسی، چیزیں مانگتا رہتا ہے تعلق قائم رکھنا چاہتی ہے تو تعجب کا مقام ہے مگر اس کے علاوہ اس کی بیوی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی کیونکہ ممتاز مفتی ایک اچھا خاوند ہے۔ لیکن ٹھہریئے یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔

ممتاز مفتی ایک ایسا بچہ ہے جو یہ پسند نہیں کرتا کہ اسے کوئی بچہ سمجھے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کرے اور اسے مناسب وقت پر مناسب کام کرنے پر مائل کرے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے ہو کہ اسے معلوم نہ ہو کہ اس کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔ اگر اسے شک پڑ جائے کہ اس سے ایک بچہ کا سا سلوک کیا جا رہا ہے تو اس میں سویا ہوا مرد بیدار ہو جائے گا اور اپنی تحقیر کے خلاف جہاد کرے گا۔ کیونکہ کسی دوسرے کی مرضی پر چلنا اسے قطعاً گوارا نہیں۔ اس کے برعکس اگر اس کی بیوی اس سے عام بیویوں کا سا سلوک کرے اور ڈر کر رہے تو وہ اسے جاہل، نکمی اور بے عقل سمجھنے لگے گا۔ اسے تمدنی جھگڑوں سے اس قدر نفرت ہے کہ بسا اوقات وہ جھگڑے کے خطرے کو روکنے کیلئے اپنی بیوی سے جھگڑا چھیڑ دیتا ہے۔

ممتاز مفتی نے زندگی میں دو بار محبت کی۔ پہلی دفعہ جب وہ محض ایک نکما لڑکا تھا اور اسے اپنا کوئی بہتر مصرف سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے گرد ایک بے گانہ اور بے پرواہ دنیا بکھری پڑی تھی۔ ایک ایسی دنیا جس میں نہ تو اس کی کوئی حیثیت تھی نہ وقعت۔ اپنی اہمیت ثابت کرنے کیلئے اس نے یہ روگ لگا لیا۔ اس کی پہلی محبت کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ تعمیری نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا انداز محبت بذاتِ خود تخریبی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمر بھر کیلئے اس کے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکہ لگ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک دائمی کشمکش کی داغ بیل پڑ گئی۔ محبت کیلئے وہ اپنے اقربا کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی برسرِ پیکار رہا۔ وہ اپنی محبوبہ سے بیک وقت مجنونانہ محبت اور نفرت محسوس کرتا تھا اس کی دوسری محبت درحقیقت اپنی پہلی محبت سے چھٹکارا پانے کی ایک شدید کوشش تھی۔ اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہو گیا۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوئے۔ اور وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوئی صورت نہ پا کر انتقاماً پھر سے اس پہلے جھمیلے میں جا پھنسا۔ تعجب کی بات یہ نہیں کہ وہ شدید ذہنی کرب اور رسوائی میں کیسے زندگی گذار سکا بلکہ یہ کہ وہ ان مشکلات کے باوجود جیتا رہا۔ اور آج ان جھمیلوں سے قطعی طور پر آزاد ہو چکا ہے۔

اس کی روزانہ زندگی میں سستی کا جذبہ بے حد کارفرما ہے۔ وہ اپنی کاہلی اور ناکارہ پن کو جانتا اور اعلانیہ تسلیم بھی کرتا ہے۔ وہ سارا دن کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ مگر شام تک مجموعی طور پر کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ بہت ضروری کام کرنا ہو تو اس وقت اس کا دل ایک ایکٹ ڈرامے پڑھنے کیلئے مچل جائے گا۔۔۔ نفسیاتی مقالہ لکھنا ہو تو راگ کی کتاب لے بیٹھے گا۔ کہانی لکھنے کی اشد ضرورت درپیش ہو۔۔۔ تو نفسیات پڑھنے لگے گا۔ چھوٹی عمر سے اسے راگ سے عشق ہے۔ اس شوق کو پورا کرنے کیلئے وہ ایک مقامی میوزک کالج میں داخل بھی ہوا۔ لیکن

انہی دنوں کالج میں ایک مدراسی آنے جانے لگ گیا۔ جو راگ کا دیوانہ تھا۔ اتفاقاً وہ مدراسی ہندوستانی نہیں سمجھتا تھا اور راگ ماسٹر انگریزی سے بے بہرہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کی ترجمانی کرنے کا فرض مفتی کو ادا کرنا پڑا۔ وہ راگ کا دیوانہ، گانے کی دھن راگ ماسٹر سے سیکھ لیتا اور پھر ممتاز مفتی سے گانے کے بول انگریزی میں ترجمہ کروا کے عجیب مضحکہ خیز انداز میں گانا شروع کر دیتا۔ بلیئے سیٹ ڈاؤن ان دی ٹرین کوائٹ لی۔ آر آئی دل گوا یوا سے سلیپ، بلیئے۔ اس دلچسپ راگ تماشا میں مفتی کو اس قدر مزا آنے لگا کہ خود کچھ سیکھنے کی بات پس پشت پڑ گئی۔ اس نے راگ کا غائر مطالعہ بھی کیا اور سروں کے تموجات، مثلاً سکیل آروہی امروہی آدھی معلومات حاصل کر لیں اور اب وہ راگ کو پورے طور پر سمجھتا ہے۔ آپ صرف اسے اتنا بتا دیں کہ کیدارا گایا جا رہا ہے پھر وہ فوراً اسے پہچان لے گا اور معاً اس کی وکر چال اور جذبات پیدا کرنے والے اتار چڑھاؤ سے محظوظ ہونے لگے گا۔ نہ سمجھے تو بھی وہ راگ سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ کچھ دن راگ سننے کے بعد اس کے دل میں شدید جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کچھ لکھے یا کرے۔ راگ سے تسکین ملتی ہے۔ ایسی تسکین جو اس میں ایک تعمیری اضطراب پیدا کرتی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے گرد و پیش کی ہر ایک چیز میں ایک عجیب سی دورخی کو شدت سے محسوس کیا۔ وہ اس بات کو جان کر حیران ہوا کہ آدمی کے دل میں بیک وقت مختلف اور متضاد خواہشات اور رجحانات موجود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ فطرت کی عجیب ترین چیز سے بھی عجیب تر ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اردو ادب اس حیران کن ہفت رنگی سے قطعاً ناواقف ہے اردو ادب نے نفس لاشعور کی آرزوؤں کو ابھی نہیں پہچانا۔ محبت کو محض محبت کے سوا کچھ نہیں سمجھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے دل میں لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ممتاز مفتی زیادہ تر دستوفسکی، یونگ، ایڈلر بر نینڈر سل اور فرائڈ کی تحریروں سے متاثر ہوا۔ کہانیوں میں نفس لاشعور کی ڈھکی چھپی باتوں کا اظہار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس لئے ممتاز مفتی کو آج تک اپنی تحریروں کے متعلق یہ یقین پیدا نہیں ہوا کہ وہ ان ان کہی باتوں کا اظہار کامیابی سے کر سکا ہے یا نہیں۔ پھر بھی اسے تسکین ہے کہ وہ قاری کی توجہ کامیابی سے اس طرف مبذول کر سکا ہے۔

احوالِ واقعی

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو زندگی گزارتے ہیں بلکہ ان میں سے ہوں جن پر زندگی گزرتی ہے۔ زندگی بھر میں نے راہ نکالی نہیں۔ راستے آتے گئے اور میں انہیں ناپتا رہا۔ چار ایک بار راستہ پیدا کرنے کے مواقع آئے لیکن جو طبعی طور پر راہ ناپنے پر مجبور ہو اسے کیا کیجیے۔ ادب کی دہلیز پر بھی میں ان جانے میں آ پہنچا۔ اور پھر دفعتاً شہرت کی ایک پھلجھڑی سی چل گئی اور میں اچھے میں رہ گیا۔ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور میں بٹالہ ایک پرانا تواریخی شہر ہے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ کو میں بٹالے میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جس کی تمام تر اہمیت زمانہ ماضی سے وابستہ تھی اور وہ بھی بعید۔ زمانۂ حال نے بٹالہ کے مفتیوں سے وفا نہ کی۔ محلے میں اس ماضی کے واضح آثار جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ سربلند چونے گچی رنگ محل دیواروں پر رنگین طغرے اور فارسی اشعار کے کتبے تہ در تہ طاقچے۔ خفیہ تہ خانے بوریوں میں بھری ہوئی کرم خوردہ قلمی کتابیں اور محلے کی بوڑھیوں کے وردِ زبان لاانتہا پارینہ داستانیں۔

دادا جوانی میں رحلت کر گئے تھے۔ والد صاحب کی پرورش پردادا نے کی تھی۔ وہ لاہور کی ایک معروف درس گاہ میں معلم تھے۔ شاہی مسجد اور قلعہ کے درمیان فصیلی دیوار کے ان حجروں میں یہ درس گاہ قائم تھی جو آج بھی جوں کی توں قائم ہیں۔ آبا مغلوں کے دربار میں میر منشی تھے۔ جہاں انہیں مفتی کا لقب عطا ہوا تھا۔ والد صاحب محکمہ تعلیم میں ملازم

تھے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

گھر کے متعلق میرے بچپن کے تاثرات کچھ ایسے ہیں جیسے۔۔ گھر تو تھا لیکن وہ گھر نہیں تھا۔ جیسے ہم گھر میں نہیں بلکہ آؤٹ ہاؤس میں رہتے تھے۔ یہ آؤٹ ہاؤس گھر کے اندر واقع تھا۔ لیکن گھر آؤٹ ہاؤس سے کوسوں دور تھا۔ لہذا کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کوئی سننے والا نہ تھا۔ کوئی اہمیت نہ تھی۔ گھر میں صرف دو شخصیتیں اہم تھیں۔ "ابا اور نئی امی" وہ دونوں گھر میں رہتے تھے۔ آؤٹ ہاؤس میں تین افراد تھے۔ اماں بڑی بہن اور میں شاید اسی لئے آؤٹ ہاؤس میں پرورش پانے والا لڑکا گونگا تنہا اور بے چارہ ہی رہا۔ والد صاحب خوش گفتار تھے۔ صاحب ذوق تھے۔ رنگیلے تھے۔ اس لئے میرے تخیل کے ہیرو تھے۔ "نئی امی" ہیروئن تھی۔ ہیرو سے فخر احترام ڈر اور عداوت کے جذبات منسلک ہو گئے۔ ہیروئن سے غم و غصہ اور بے اندازکش۔ اس بھنور میں ایسا گرا کہ سال ہا سال ڈبکیاں کھاتا رہا۔

باہر گلی میں لڑکے تو تھے۔ لیکن جھجک اور علیحدگی کے جذبات کی وجہ سے انہیں ساتھی نہ بنا سکا۔ یوں گلی اور محلہ گھر کی طرح ویرانہ ہی رہے۔ مدرسہ میں بھی والد ہی کرسی نشین تھے۔ ہر سال بغیر کہے کہلائے رعائتی پاس ہو جانا یقینی تھا۔ لہذا پڑھنے سے چھٹی ہو گئی۔ نہ طلب پیدا ہوئی اور نہ علم حاصل ہوا۔ میٹریکولیشن کے بعد اسی ازلی جھجک کی وجہ سے اسلامیہ کالج راس نہ آیا۔ ڈی پی ایم کالج انبالہ اور اس کے بعد ہندو سبھا کالج امرتسر میں پناہ لینی پڑی۔ وہاں کچھ بات چل نکلی لیکن پڑھائی میں وہی بے دلی قائم رہی ۱۹۲۷ میں پھر سے اسلامیہ کالج لاہور میں تھرڈ ایر کا داخلہ لیا۔ جھجک تو اب بھی موجود تھی لیکن اس کی دھار میں وہ کاٹ نہ رہی۔

ان دنوں اتفاق سے ایک ایسے شخص کے قرب میں رہنے کا موقع مل گیا جس میں طلبِ علم کا شوق دیوانگی کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھا۔ اس قرب کی وجہ سے میرے ذہن میں ایک بیداری سی پیدا ہو گئی۔ اس کا نام فیاض محمود تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے فیاض محمود ایک جزیرہ تھا۔ تن تنہا۔ طنز اور تیوری سے مسلح۔ وہ کسی کو قریب آنے نہیں دیتا تھا۔

کوئی آنے کی کوشش کرتا تو طنز کے طمنچے سے گولیاں چلتیں۔ جا پہنچتا تو طلبِ علم پیر تسمہ پا کی طرح شانوں پر سوار ہو جاتی پتہ نہیں کیسے میں فیاض محمود کے پاس جا پہنچا۔ فیاض محمود کے قرب کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں بے مقصد مطالعہ کی لذت سے آشنا ہوا۔

دوسری شخصیت جس سے میں متاثر ہوا مجید ملک کی تھی۔ مجید ملک بنیادی طور پر شاعر تھے۔ ان کی شخصیت میں رنگینی اور رکھ رکھاؤ کا عجیب امتزاج تھا۔ ان کا مزاج محبوبانہ تھا انداز رندانہ مجید ملک میری زندگی میں سکندرِ اعظم کی طرح آئے تھے اور چلے گئے۔ لیکن ان کی شخصیت کی رنگینی دیر تک قائم رہی جیسے غروبِ آفتاب کے بعد دیر تک افق پر رنگ کی دھاریاں قائم رہتی ہیں۔

۱۹۲۹ میں نے بی اے پاس کیا۔ یہ وہ دور تھا جسے مالی انحطاط کا زمانہ کہا جاتا تھا۔ اقتصادیات کے ماہرین کا خیال تھا کہ یہ مالی انحطاط پہلی جنگِ عظیم کی وجہ سے ہے۔ پہلی جنگِ عظیم مدت سے ختم ہو چکی تھی۔ سانپ گزرے دس سال بیت چکے تھے۔ لکیریں اب ابھر رہیں تھیں۔ بی اے میں اقتصادیات پڑھنے کے باوجود یہ معمہ سمجھ میں نہ آیا۔ کہا جاتا تھا یہ انحطاط عالمی ہے۔ برِ صغیر میں یہ حالت تھی کہ تمام مقابلے کے امتحانات منسوخ ہو چکے تھے۔ دفتروں میں تخفیف کا کلہاڑہ چل رہا تھا۔ تنخواہوں میں کاٹ ہو رہی تھے۔ نوجوانوں کے لئے ملازمت حاصل کرنا ناممکن تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے دور کے تمام نوجوان اس انحطاط کی بھینٹ چڑھ گئے۔

بی اے کے بعد میں نے سٹینو گرافی کی۔ اس زمانے میں بی اے سٹینو گرافر خال خال سے بھی کم تھے۔ کمشنر راولپنڈی نے میرا کام جانچا پسند کیا اور اپنا سٹینو بنا لیا۔ یہ آسامی بڑی حیثیت کی آسامی تھی، صرف دقت یہ تھی کہ تنخواہ کے بغیر کام کرنا پڑتا تھا۔ چونکہ ابھی آسامی کی منظوری نہیں ملی تھی۔ یہ جان کر کہ مجھے اس آسامی پر کام کرنا منظور نہیں دفتر والے بے حد حیران ہوئے انہوں نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ برخوردار ایسے سنہری مواقع زندگی میں بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر تنخواہ کی نوکری کو

کس لحاظ سے سنہری موقع سمجھا جا سکتا ہے۔ ان دنوں مجھے بالائی آمدنی کی اہمیت کا شعور نہ تھا۔
تنخواہ والی ملازمت حاصل کرنے لئے مجھے فنِ معلمی سیکھنے کے لئے سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخل ہونا پڑا۔ بی ٹی میں مجھے داخلہ نہ ملا۔ چونکہ میرے مضامین سکول سے متعلق نہ تھے۔ بی اے میں نے فلسفہ اور اقتصادیات میں کیا تھا۔ اردو فارسی اور عربی سے قطعی ناواقف تھا۔ بعد میں مشکل سے مجھے ایس۔ اے۔ وی میں داخلہ ملا۔

ابھی تک فیاض محمود سے میل جول قائم تھا۔ بے غرض مطالعہ کا سلسلہ قائم تھا۔
پھر محبت کا ایک رنگین بلبلہ پھوٹا۔ میں نے مزید شدت سے کتاب میں پناہ لی۔ مطالعہ کا یہ جذبہ مثبت نہ تھا۔ مقصد فرار تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس میں دیوانگی کا عنصر پیدا ہوا۔ ادھر دیوانگی پر بہار آئی۔ ادھر ان دنوں پنجاب پبلک لائبریری جوبن پر تھی۔ ہمارا میل ہو گیا۔ اور پھر خوب گزری۔ ابتدا میں میں نے مطالعہ لٹریچر سے شروع کیا تھا، لیکن طبعی جمود کی وجہ سے ادب کی رنگینی راس نہ آئی۔ اس لئے سنجیدہ چیزوں کی طرف چل نکلا، کانٹ برٹرینڈر سل ہالڈین، نٹشے، برگساں، فرائڈ جیسی سنجیدہ چیزوں نے میری پیشانی پر تیوری چڑھا دی۔
پھر جب اس کا احساس ہوا تو فلسفے کو چھوڑ کر نفسیات کی طرف آ پہنچا۔ لٹریچر میں مجھے کافکا اور داستووسکی کھا گئے۔ کافکا اور داستووسکی میں وہی بے بسی وہی بے چارگی وہی اکیلا پن تھا۔ ایک مناسبت سی تھی یا شاید اس لئے کہ داستووسکی میں مجھے زندگی کا تضاد ملا۔
داستووسکی کے کردار ایک ہی ساعت میں ہنستے بھی تھے روتے بھی تھے۔ حاتم میں مخل ابھرتا۔ طائفہ میں سے راہبہ جھانکتی، خود پرست قربانی کے جذبے سے سرشار ہو جاتا۔ سورما خوف سے تھر تھر کانپتا۔ بھڑوں کی بھن بھن کرتے ہوئے رنگارنگ الٹے سیدھے متضاد جذبات کی بھیڑ میں مجھے زندگی کی جھلک دکھائی دی۔
۱۹۳۱ میں سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہوا تو انحطاط کا وہ عفریت اور بھی بھیانک ہو چکا تھا۔

پروفیسر کی ابتدائی تنخواہ ۱۲۰ سے ۶۵ تک گر چکی تھی۔ سینئر انگلش ٹیچر کی ۸۰ سے

۴۵ تک اور ملازمت حاصل کرنا مشکل تھا۔
ٹریننگ کالج میں جدید طریق تعلیم و تربیت کا مطالعہ کرنے کے بعد سکول میں پڑھانے کی آسامی مل گئی۔ سکول میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے پاس بٹھا کر بڑے پیار و محبت سے مجھے سمجھایا۔ بولے دیکھ بچے۔ بچوں کو نئے نفسیاتی اصولوں کے مطابق پڑھانے کی کوشش نہ کرنا۔ بیٹا یہ کتابی باتیں زندگی میں نہیں چلتیں۔ یہ ہاتھی کے دانت صرف دکھانے کے لئے ہیں۔

بارہ سال مختلف مدرسوں کا ماحول میرے لئے یوں تھا۔ جیسے استوائی خطے کے کسی جانور کو قطب شمالی میں جا کر چھوڑ دیا ہو۔ اساتذہ بڑے معقول حسین اور وضع دار تھے۔ اگر نہیں تھے تو بھی ایسا دکھنے کی شدید کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ذاتی اہمیت سے پھولے ہوئے تھے۔ اپنے فیصلے کو آخری فیصلہ سمجھتے تھے۔ رسمی وقار کی بوجھل گٹھڑی اٹھائے بغیر ایک قدم نہ اٹھا سکتے تھے۔ قہقہہ لگانے کی جگہ مسکرانا کافی سمجھتے تھے۔ مسکرانے کی جگہ گھورتے۔ طے شدہ باتوں کے متعلق سوچنا ان کے نزدیک جرم تھا۔ اور ہٹ کر بات کرنے والا مشتبہ تھا۔ ان کے نزدیک میری حیثیت ہمیشہ قدرے دلچسپ مگر بیشتر مشکوک رہی۔ اگر میں نے بارہ سال مدرسے کے ماحول میں بسر کئے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ازلی طور پر میں راہ ناپنے والا تھا، راستہ بنانے والا نہیں۔
اس دور میں مجھے صرف ایک ساتھی ملا۔ جس نے میری زندگی پر بہت اثر ڈالا۔ محکمہ تعلیم میں وہ میرا ہم کار تھا۔ میاں حفیظ الرحمٰن بلا کا ذہن رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت میں رنگ کی دھاریاں تھیں۔ اس نے مجھے کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری پڑھنے کی لت ڈالی۔ میاں اور میرا ساتھ پندرہ برس تک رہا۔

انہی دنوں ایک بار چھٹیوں میں والد صاحب سے ملنے ملتان گیا تو وہاں میری ملاقات ن م راشد سے ہوئی۔ ان دنوں وہ بھی نذر محمد تھے۔ اور میں ممتاز حسین تھا۔ وہ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ شاید ہماری واقفیت علیک سلیک تک محدود رہتی۔ لیکن ہم دونوں کے

والد محکمہ تعلیم میں تھے اور دفتر میں ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ لہذا راشد اور میں قریب تر ہو گئے۔ ان دنوں راشد "تائیس" یا شاید "افروداتا تمیں" کا اردو ترجمہ کر رہے تھے۔ انہیں فارسی اور اردو میں دسترس تھی۔ میں دونوں میں کورا تھا۔ ہمارے درمیان گفتگو کا واحد موضوع نفسیاتی زاویے تھا۔

انہی دنوں راشد کے ایک دوست کو جو ملتان سے ایک اردو جریدہ "نخلستان" مرتب کرتے تھے۔ ناگاہ باہر جانا پڑا۔ پرچے کی ادارت وہ راشد کے ذمے کر گئے۔ راشد نے صفحات پری کے لئے مجھ سے لکھنے کو کہا۔ اردو میں لکھنا میرے لئے ناممکن تھا۔ بہر صورت میں نے کوشش کی۔ ایک اردو فلم "ہٹیلی دلہن" پر طنز لکھی یہ طنز ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی نگاہ چڑھی۔ انہوں نے گوجرہ ہائی سکول کے میگزین کے سالنامے کے لئے فرمائش کی۔ افسر کا حکم کیسے ٹالتا۔ گھر کے موضوع پر ایک مضمون "الجھاؤ" لکھا پھر پتہ نہیں کیسے منصور احمد نے جو ادبی دنیا کے ایڈیٹر تھے۔ سالنامے کے لئے مختصر افسانہ مانگا۔ ۱۹۳۶ کے سالنامے میں میرا پہلا مختصر افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" ایک لمبے چوڑے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا۔ دیکھ کر دل میں ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ چھ مہینے بعد چھپنے یا لکھنے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ ایک کہانی لکھ کر ادبی دنیا کو بھیجی۔ اس دوران میں منصور احمد ناگہانی طور پر انتقال کر چکے تھے اور ادارت کے فرائض عاشق بٹالوی سرانجام دے رہے تھے۔ میری کہانی مجھے لوٹا دی گئی۔ مسودہ سرخ سیاہی سے رنگا ہوا تھا۔ منسلکہ خط میں لکھا تھا۔ "اگر آپ ترجمہ کی جگہ کوئی طبع زاد چیز لکھیں تو بہتر رہے۔

اگر خالی مسودہ ہی لوٹا دیا جاتا تو شاید مجھے دھچکا لگتا اور لکھنے کی یہ عیاشی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔ لیکن اس منسلکہ خط نے مجھے بچا لیا۔ اس زمانے میں دلی سے ایک نیا پرچہ ساقی نکلا تھا۔ میں نے وہ ساقی کو بھیج دی۔ اور وہ جوں کی توں چھپ گئی۔ اس کے بعد ساقی کو میں نے کئی ایک چیزیں بھیجیں۔ شاہد احمد میں یہ خوبی تھی کہ نہ تو وہ تعریفی نوٹ چھاپنے کے شوقین تھے نہ تصحیح کے۔ ان کے خطوط کاروباری انداز کے حامل ہوتے تھے۔

پھر ادبی دنیا میں مولوی صلاح الدین اور میراجی آ گئے۔ اتفاقاً ان سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے کئی ایک چیزیں لکھوائیں۔ اور ان پر تبصرے چھاپے یوں لکھنے اور چھاپنے کا دھندا شروع ہو گیا۔ اس کے باوجود میری زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ شہرت لائم لائٹ نہ بنی۔ قصور میرا اپنا تھا۔ نہ میں نے ادبی حلقوں کی طرف رجوع کیا نہ پبلشروں سے ملا۔ نہ اپنی تحریروں کے بارے میں تذکرہ کیا۔ مدرسے میں میں ممتاز حسین تھا۔ لکھنے والا مفتی تھا۔ کسی محفل میں دونوں کا کبھی میل نہ ہوا۔

دیر تک مدرسہ میں کسی کو علم نہ ہوا کہ میں لکھتا ہوں اور جب ہوا تو اساتذہ نے پاس بٹھا کر کمال شفقت سے مجھے سمجھایا۔ کہنے لگے میاں ادب پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی جگہ ہے۔ سنجیدگی اور متانت نہ ہو تو ادب نہیں ہوتا۔ اس بے ادبی کو چھوڑو اور اگر ضرور لکھنا ہے تو پاکیزہ موضوع چنو۔ مثلاً مذہب ہے، اخلاق ہے۔

اس کے بعد مدرسے میں میرے ہمکار مجھے قابلِ ہمدردی سمجھنے لگے اور میرے برتاؤ کی تفصیلات پر کڑی نگاہ رکھنے لگے۔ اساتذہ سے بات افسران بالا تک پہنچی ایس ایم شریف ایم اے کینٹ نے مجھے خصوصی طور پر بلا کر مشورہ دیا کہنے لگے جھکی جھکی آنکھوں والیوں پر کہانیاں لکھنے سے طالب علموں پر برا اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً جب لکھنے والا ٹیچر ہو اگر تم لکھنا ہی چاہتے ہو تو میاں انگریزی میں لکھو۔ انگریزی میں لکھنے سے بات میں معقولیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس زمانے میں کرشن چندر، عصمت، فیاض محمود اور بیدی کے افسانے چھپ رہے تھے۔ منٹو ابھی روسی تراجم میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ غلام عباس بھی گاہے گاہے دیکھنے میں آتے تھے۔ یہ سب لوگ ادب برائے ادب کے انداز میں لکھتے تھے۔

پھر ترقی پسندی کا شوشہ چل نکلا اور سر وار کرشن چندر، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی ابھرے۔ ہم سب کو ترقی پسند قرار دیا گیا۔ تو فرطِ انبساط سے ہماری باچھیں کھل گئیں، پھر ترقی پسندی کا راز کھلا تو بڑا ہنگامہ ہوا۔ بہت چھینٹے اڑے۔ سانپ نکل گیا لکیریں آج

تک باقی ہیں۔ ترقی پسندوں نے منٹو اور مجھے ادبی جریدوں سے ban کر دیا۔ ادبی محاذ کرنا اپنے بس کا روگ نہ تھا۔ سو دبک کر بیٹھ گئے۔ مکتبہ اردو کے مالک چودھری برکت علی پہلے پبلشر تھے۔ جن سے میری ملاقات ہوئی۔ چونکہ وہ درسی کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ لہذا اکثر سکول میں آیا کرتے تھے۔ ان کے مسلسل اصرار کی وجہ سے میرا پہلا مجموعہ "ان کہی" شائع ہوا، برکت علی خوب آدمی تھے۔ کئی ایک سال تک ہمارا ساتھ رہا۔

۱۹۴۵ میں میں نے محکمہ تعلیم چھوڑ دیا اور ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۷ میں اپنی فلم کہانی "سلطانہ رضیہ" فلمانے کے سلسلہ میں بمبئی چلا گیا۔ تقسیم کے بعد وہاں رہنے کے لئے دل نہ مانا۔ میرے دوست احمد بشیر بھی میرے ساتھ تھے۔ وہاں ہم اندھیری میں کرشن کے ہاں رہتے تھے۔ میراجی بھی ہمارے ساتھ رہتے تھے۔

پاکستان پہنچ کر کئی ماہ تلاش روزگار کے لئے یہاں وہاں جوتے چٹخارتے پھرے۔ انہیں دنوں میری ملاقات اشفاق اور اس کی بیگم قدسیہ سے ہوئی۔ اشفاق اور قدسیہ نے میرا دامن خوشی سے بھر دیا۔ آج بھی مٹھاس کی وجہ سے میری زندگی شیریں ہے۔

تقسیم کے بعد میں نے جگہ جگہ ملازمت کی۔ ہفتہ وار استقلال ہوائی فوج اور آزاد کشمیر ریڈیو پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے اطلاعات میں ایک پکی نوکری مل گئی۔ اس وقت تک میرے کئی ایک مجموعے چھپ چکے تھے: گہما گہمی، غبارے، چپ، اسمارائیں، نظام سقہ، یہ سب مجموعے شوق کے تحت نہیں بلکہ ضرورت کے تحت چھپے تھے۔ مثلاً ایک مجموعہ بمبئی پہنچنے کے لئے کرایہ حاصل کرنے کے لئے چھپا۔ ایک مجموعہ ریڈیو سیٹ خریدنے کے لئے چھپا۔ یوں ضرورت نے مجھے صاحب کتاب بنادیا۔

پبلک سروس کمیشن کے توسط سے پکی نوکری ملنے کے بعد ضرورت کی دھار میں وہ کاٹ نہ رہی۔ لہذا یہ شوق چرایا کہ مسلسل کتاب لکھوں۔ ان دنوں میری خوش قسمتی سے اشفاق احمد پبلشر بنے ہوئے تھے۔ سیاں بھئیے کو توال والی بات تھی۔ ۱۹۶۱ میں میری مسلسل

کتاب "علی پور کا ایلی" چھپی۔ یہ کتاب افراتفری میں چھپی تھی۔ اس افراتفری کی وجہ آدم جی انعام تھا۔ انعام نہ ملا اور "علی پور کا ایلی" اس وجہ سے مشہور ہو گئی کہ اس پر انعام نہ ملا۔ اس ضخیم کتاب کو چھاپنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ پبلشر کی کمر ٹوٹ گئی اور اشفاق احمد از سر نو اپنی پرانی جگہ ادیبوں کی صف میں آکھڑے ہوئے۔ اشفاق احمد نے "علی پور کا ایلی" کے علاوہ میرا ایک مجموعہ "گڑیا گھر" بھی چھاپا تھا جسے گلڈ نے اٹھالیا اور بوریوں میں بند کر کے کسی گودام میں رکھوا دیا۔

اب "لکھ یار" کے تقاضے پر یہ مجموعہ اشاعت کے لئے دے رہا ہوں۔ "لکھ یار" چند ادیب دوستوں کی انجمن ہے جس کا مقصد ممبروں کو لکھنے پر مائل کرنا نہیں بلکہ مجبور کرنا ہے چاہے نوبت تشدد تک پہنچے۔

۱۹۵۸ میں میں قدرت اللہ شہاب سے متعارف ہوا۔ یہ تعارف میری ادبی زندگی کے لئے حادثہ سے کم نہ تھا۔ انہوں نے میرا زاویہ نظر یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ایسے حقائق میری نگاہ پڑے جن کے وجود سے میں قطعی طور پر ناواقف تھا۔ پرانے بت گر کر چور چور ہو گئے۔ افسانہ نویسی کا پایہ ستون ریزہ ریزہ ہو گیا۔ دانشوری کا لبادہ تار تار ہو گیا۔ جو پاس تھا۔ وہ کھو گیا۔ جو محسوس کیا اسے صفحۂ قرطاس پر لانے کی صلاحیت نہیں۔ اگر کبھی یہ صلاحیت حاصل ہوئی اور زندگی نے وفا کی تو شاید میں تفصیلی طور پر بیان کروں کہ وہ افسانہ نویس جو نفس غیر شاعر کی ان کہی کی کہانی لے کر اٹھا تھا۔ اس پر کیا بپتا پڑی۔ قدرت اللہ میری زندگی کا عظیم Experience ہے اور عظیم Experience رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔

پاکستان (۱۹۶۶ء)

سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس موضوع پر کیوں لکھ رہا ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ بھی

سمجھ میں نہیں آتا کہ آج تک میں نے اس موضوع پر کیوں نہیں لکھا۔ جبکہ کئی ایک سال سے یہ موضوع میرے کندھوں پر جزیرے کے بڈھے کی طرح سوار ہے۔ جبکہ عرصہ سے میں ایک ویران گھر کی مصداق ہوں۔۔۔ آسیب زدہ گھر۔۔۔ آسیب پاکستان ہے۔

میرے لئے پاکستان ایک معمہ ہے، ایک پراسرار سایہ۔ پاکستان کے شانے پر کس کا پراسرار ہاتھ ہے؟ پاکستان کی ناؤ کو کون کھے رہا ہے۔ پاکستان کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے؟ کیوں؟ بیٹھے بٹھائے میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے ساتھ چوتھی سمت ملحق ہے۔ پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ میرے دل میں سوال اٹھتا ہے۔ پاکستان کیا ہے؟ اسے کیا خصوصیت حاصل ہے؟ اس کے ساتھ چوتھی سمت کیوں وابستہ ہے؟۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔ پراسرار مسکراہٹ۔۔۔ طنز بھری مسکراہٹ۔۔۔۔ اور بس۔۔۔۔ خوف کی ہلکی ہلکی لہریں چاروں طرف سے اٹھتی ہیں۔ میری طرف بڑھتی ہیں۔۔۔ ایک گرداب بن جاتی ہیں اور میں ڈوبنے لگتا ہوں۔ ڈوبے جاتا ہوں۔۔۔ ہاں مجھے پاکستان سے ڈر آتا ہے۔ لیکن۔۔۔ آخر میں اس موضوع پر کیوں لکھ رہا ہوں، کیسے لکھ سکتا ہوں۔ آپ اس موضوع پر لکھ سکتے ہیں۔ جس سے آپ دور کھڑے ہوں۔ جس کا آپ احاطہ کر سکیں۔ لیکن۔۔۔ اگر آپ کسی موضوع میں ڈوب چکے ہیں

تو آپ اس پر کیسے لکھ سکتے ہیں۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھ سکتے ہیں۔۔۔ لیکن اگر آپ جھیل میں ڈوب رہے ہیں تو آپ جھیل کو دیکھ نہیں سکتے۔ نہیں اس موضوع پر لکھنا میرے بس کا روگ نہیں۔ عجز کا احساس مجھے شل کر رہا ہے۔ اگر میں دو ایک جھلکیاں دکھانے میں کامیاب ہو بھی جاؤں تو بھی بے کار ہے، آپ میری بات سنیں گے مگر نہیں سنیں گے۔۔۔ سمجھیں گے مگر نہیں سمجھیں گے۔

میں نے اپنے قریبی دوستوں سے اس موضوع پر بات کر دیکھی ہے۔ وہ بات غور سے سنتے ہیں۔ اثر سے بھیگ جاتے ہیں۔ لیکن صرف ایک ساعت کیلئے۔ دوسری ساعت میں ان کے پر یوں خشک ہو جاتے ہیں جیسے کبھی بھیگے ہی نہ تھے۔ جیسے انہوں نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ ان کا رویہ دیکھ کر مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ آپ راز سے پردہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن راز فاش نہیں کر سکتے۔ آپ راز سے پردہ اٹھائیں گے نا۔ دیکھنے والے کی آنکھ سے پردہ کون اٹھائے گا۔ معلوم ہوتا ہے افشائے راز کو وقت سے تعلق ہے۔۔۔ کون سا وقت۔۔۔۔ کیسا وقت۔۔۔ وہ وقت کب آئے گا؟ کب؟

چھوڑیئے یہ تحریر بالکل بے کار ہے۔۔۔ جسے خود کچھ علم نہیں۔۔۔ جو خود نہیں جانتا وہ بتائے گا کیا لکھے گا کیا۔۔۔ جس پر خود بھید آشکار نہیں۔ وہ کیسے پردہ اٹھائے گا۔ کس حقیقت سے پردہ اٹھائے گا۔۔۔ عبث ہے یہ تحریر بالکل عبث ہے۔۔ لیکن۔۔ اس کے باوجود میں اس موضوع پر لکھنے پر مجبور ہوں۔

جس زمانے میں پاکستان کے قیام کیلئے جدوجہد ہو رہی تھی ان دنوں میرے دل میں پاکستان کیلئے کوئی جذبہ نہ تھا۔ نہ مثبت نہ منفی۔ میرے لئے پاکستان کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسلمان الگ ملک کیوں مانگ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمانوں کے اس مطالبے پر ہندو کیوں چراغ پا ہوتے ہیں۔ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میرے لئے ایک ایسا ڈرامہ تھا جو سامنے۔۔۔ مگر دور، بہت دور کھیلا جا رہا تھا۔ اس ڈرامے کو میرے جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے ہی جیسے کسی چیز کو آپ دیکھتے ہیں اس پر سوچتے ہیں ذہنی طور پر اسے سمجھتے

بھی ہیں لیکن وہ آپ کی زندگی کا جزو نہیں بنتی ۔۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسلامی جذبے سے قطعی طور پر کورا تھا۔

اسی دور کی بات ہے، میرا ایک دوست مجید تھا۔ تھا تو مغرب زدہ لیکن قیام پاکستان کی جدوجہد میں پیش پیش تھا۔ ایک روز میں نے مجید سے پوچھا۔ بھئی سمجھ میں نہیں آتا کہ قیام پاکستان کیلئے تم اتنے دکھی کیوں ہو رہے ہو؟ مجید ہنسا، بولا "ظاہر ہے"۔

میں نے کہا "ظاہر تو کچھ بھی نہیں"۔

بولا "بھئی اس لئے کہ میں مسلمان ہوں"۔

اس پر میری ہنسی نکل گئی میں نے کہا، بھائی میرے نہ تم نماز پڑھتے ہو، نہ روزہ رکھتے ہو، نہ تمہارے رہن سہن میں اسلامی جھلک ہے۔ پھر تم مسلمان کیسے ہوئے؟

مجید نے کہا۔ اس طرح کہ اگر میں گھر سے باہر نکلوں، دیکھوں کہ بازار میں ایک ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں تو میں یہ نہ پوچھوں گا کہ بات کیا ہے۔ یہ نہیں سوچوں گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ یا قصور کس کا ہے۔ پوچھے بغیر میں ہندو کو پیٹنا شروع کر دوں گا۔ مسلمان ہونے کی یہی تو ایک نشانی ہے اور میں تو بھئی خالی مسلمان ہی نہیں، بلکہ پکا مسلمان ہوں، پکا۔

کیا مطلب، میں نے پوچھا۔

ایک ساعت کیلئے اس نے سوچا پھر بولا، مثلاً اگر ابھی اس کمرے کی چھت پھٹ جائے اور اوپر سے ایک تخت اتر آئے، تخت پر ایک فرشتہ بیٹھا ہو۔ فرشتہ مجھ سے کہے کہ اللہ میاں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ فرمایا ہے کہ جاؤ مجید پر اس حقیقت کا انکشاف کر دو کہ اسلام سچا مذہب نہیں ہے۔ تو میں فرشتے کو جواب دوں گا کہ اللہ میاں کو میرا اسلام کہنا اور عرض کرنا کہ حضور کا پیغام مل گیا۔ شکریہ! لیکن مجید مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔

مجید کی اس بات نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ کئی روز میں گہری سوچ میں پڑا رہا۔ شاید بنیادی طور پر مذہب جذبے ہی کا نام ہے ۔۔۔ اس کے باوجود میرے دل میں جذبہ پیدا نہ ہوا

۔۔۔نہ اسلام کیلئے نہ پاکستان کیلئے۔

پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے جب چھرابازی کے واقعات عام ہو چکے تھے۔ میں بمبئی میں مقیم تھا۔ ان تشدد بھرے واقعات کو دیکھ کر مجھے ہندوؤں پر غصہ آنے لگا۔ آخر قیام پاکستان پر وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے تھے۔ کیوں تشدد پر تلے ہوئے تھے۔ سڑکوں اور گلیوں میں نہتے راہ گیروں کو خنجر مارنے سے کیا پاکستان کے قیام کو روکا جا سکتا ہے ۔۔۔ پاکستان میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

انہی دنوں بمبئی کی سٹیج پر پاکستان کے قیام کے خلاف کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ان کھیلوں کے روح رواں پرتھوی راج تھے۔ پرتھوی راج کو میں ایک عظیم فنکار سمجھتا ہوں۔ ان دنوں بھی میرے دل میں ان کیلئے بے پناہ عزت تھی۔ ایک روز میں کھیل دیکھنے گیا۔ پیش کش اعلیٰ تھی، اداکاری عمدہ تھی۔ لیکن پراپیگنڈا بھونڈا تھا۔ کھیل ختم ہوا تو تھیٹر کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ تماشائیوں کے باہر نکلنے کیلئے ایک خصوصی راستہ کھولا گیا۔ یہ راستہ ایک تنگ اور گھومتی ہوئی گلی پر مشتمل تھا۔ جس میں صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ اس لئے تماشائی ایک دوسرے کے پیچھے لمبی قطار میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ گلی کے ایک فراخ گوشے میں پرتھوی راج تھیٹر والی میک اپ میں کھڑا تھا۔ اس کا سر عجز و احترام سے جھکا ہوا تھا۔ جھولی نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ جس میں چند ایک چیک بھی تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ قیام پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کیلئے "دان" مانگ رہا تھا۔ پرتھوی راج کو عجز کی تصویر بنے دیکھ کر میرے دل میں پیار کا ایک ریلا اٹھا۔ لیکن جھولی دیکھ کر غصہ آ گیا کیا یہ شخص توقع رکھتا ہے کہ مسلمان پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کیلئے چندہ دیں گے۔ کیا یہ شخص مجھ سے توقع رکھتا ہے کہ میں ۔۔۔ میں پاکستان کے خلاف جدوجہد چلانے کیلئے چندہ دوں گا ۔۔۔ مجھ سے توقع رکھتا ہے۔ جی چاہا کہ جیب سے ہاتھ نکال کر پرتھوی راج کو مکا دکھا دوں اور دانت پیس کر کہوں "اتنی جسارت" لیکن طبعاً میں ایک کمزور آدمی ہوں اور محفل کے رنگ سے ہٹ کر بات کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔ میرا ہاتھ مکا نہ بن سکا۔ الٹا اس نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر پرتھوی راج کی جھولی میں ڈال دیا۔

اس رات غصے کی وجہ سے مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ میں نے پاکستان کے خلاف چندہ کیوں دیا، کیوں۔ میں نے پرتھوی راج کو مکا کیوں نہ دکھایا۔۔۔ اس کے بعد جب بھی خبر آتی کسی غنڈے نے راہ گیر مسلمان کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا ہے تو میں محسوس کرتا کہ وہ غنڈہ میرے ان پانچ روپے کے عوض کرایہ پر لیا گیا تھا۔ میرے ان پانچ روپے کے نوٹ کی وجہ سے ایک مسلمان کا پیٹ چاک ہو گیا تھا۔ غنڈے کے چھرے کے دستے پر میرا نام کندہ تھا۔ اُس روز احمد بشیر اور میں بمبئی کے ایک ہندو علاقے سے گزر رہے تھے۔ ذاتی طور پر میں کبھی اس علاقے سے گزرنے کی جسارت نہ کرتا مگر میرا ساتھی احمد بشیر طبعاً خطرے سے دوچار ہونے کا دلدادہ تھا۔ وہ پیدائشی پاکستانی تھا۔ ڈر اور خوف سے بے پرواہ۔ خطرے کا پروانہ۔ وہ مجھے زبردستی ایسے مقامات پر لے جاتا تھا۔۔۔ دفعتاً ٹریفک رک گئی چوک میں ہندوؤں کا ایک ہجوم کھڑا تھا "سب پیدل چلنے والے بائیں ہاتھ پٹڑی پر آجائیں"۔ کسی نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا۔ تمام لوگ پٹڑی پر اکٹھے ہو گئے۔ باری باری کیو میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے گھبرا کر احمد بشیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر تبسم تھا۔ پٹڑی پر ایک میز رکھا تھا۔ ایک آدمی رجسٹر سامنے رکھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہر راہ گیر رجسٹر پر اپنا نام اور ولدیت لکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ نام لکھوانے کا مقصد مسلمانوں کو چھانٹنا ہے۔ آرتھر، میں نے باآواز بلند احمد بشیر سے کہا۔ پہلے تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر سمجھ گیا۔ آرتھر یہ سب کیا ہے۔ میں نے دہرایا۔ کچھ بھی نہیں مائیکل اس نے باآواز بلند کہا اور ہنسنے لگا۔ گورنمنٹ کے نام کوئی اپیل بھیجی جارہی ہے جس پر دستخط کرا رہے ہیں۔ کیوں مسٹر اس نے ساتھ کھڑے لالہ جی سے پوچھا۔ او کے؟

جب میں رجسٹر پر دستخط کرنے لگا تو مجھ پر ایک وحشت سی سوار ہو گئی جی چاہا کہ چیخ چیخ کر کہوں کہ میں محمد ممتاز ہوں، محمد ممتاز، میں مسلمان ہوں۔ پاکستانی ہوں، میرے پیٹ میں چھرا بھونک دو۔ وہی چھرا جسے ان پانچ روپوں سے خریدا گیا ہے جو میں نے چندے کے طور پر دیئے تھے۔ میں نے پاکستان کے خلاف جرم کیا ہے۔ یہی میری سزا ہے۔ میں نے چیخ چیخ کر اعلان کیا لیکن میرے حلق میں آواز نہ تھی کسی نے میرا اعلان نہ سنا اور میں نے چپکے سے مائیکل موفٹی ولد جان موفٹی بقلم خود رجسٹر میں لکھ دیا اور آگے چل پڑا۔

یہ سچ ہے کہ مجھ میں جرات نہ تھی۔ لیکن پاکستان اور میرے درمیان اب قطعی طور پر کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ پاکستان میرے جذبات میں داخل ہو چکا تھا۔ بظاہر ایک دیوار حائل تھی۔ جرات کی دیوار۔

پھر جو میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا تو کسی میں بھی جرات نہ تھی۔ کانگرس مسلمانوں اور دنیا کو دھوکا دے رہی تھی۔ پرتھوی راج اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ سب جھوٹے تھے۔ صرف دو افراد سچے تھے، صرف دو۔ ان میں خلوص تھا، وہ پاکستانی جو اللہ اکبر کے نعرے لگاتا تھا اور وہ غنڈہ جو اجرت لئے بغیر مسلمان راہ گیر کے پیٹ میں چھرا بھونکتا تھا۔۔۔ اور میں، بے شک میں بزدل تھا میرا دل جذبے سے خالی تھا لیکن میں جھوٹا نہ تھا۔ نہ دوسروں کو فریب دیتا تھا۔ نہ اپنے آپ کو۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن آگیا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کیلئے مثبت جذبہ محسوس کیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہم ریڈیو سیٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ ریڈیو پر سگنیچر ٹیون بج رہی تھی۔ دف کی گمک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جیسے طبل جنگ بج رہا ہو۔ اونچے سروں میں طوطی للکار رہی تھی۔ لیکن میرے لئے اس سگنیچر ٹیون کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی میں کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ دفعتاً اعلان ہوا، ریڈیو پاکستان۔۔۔ میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔۔۔ سارے جسم پر چونٹے رینگنے لگے۔ دل میں ایک ہوائی سی چھوٹی۔ سارے وجود میں رنگین ستارے ناچنے لگے۔ پاکستان کیلئے یہ میرا پہلا مثبت جذبہ تھا۔ جس نے ان جانے میں میرے بند بند کر جھلا دیا۔ جیسے چودھویں کا چاند سوئے ہوئے سمندر کو چابک مار کر جگا دیتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد بمبئی میں شہرت اور امارت کے واضح امکانات مہمل دکھائی دینے لگے۔ سازو سامان جس کے حصول کیلئے ہم بمبئی گئے تھے اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔

لہٰذا احمد بشیر اور میں جوں توں پاکستان آپہنچے۔ یہاں پہنچ کر صرف ایک فکر دامن گیر تھا کہ اپنے عزیز و اقارب کو ضلع گورداس پور سے نکال کر پاکستان لے آئیں۔۔۔ پاکستان ہمارے لئے دارالسلام بن گیا تھا۔ پاکستان میں ہمارے لئے مسلمانوں کیلئے سلامتی تھی۔ اب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہوں۔ چاہے میرے دل میں ایمان کی روشنی تھی یا نہیں تھی۔ چاہے میری زندگی اسلام کے رنگ میں رنگی تھی یا نہیں۔ چاہے میرے قلب میں اسلامی جذبہ تھا یا نہیں۔ بہر حال میں مسلمان تھا۔

قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کے کیمپوں میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ دیکھ کر مشرقی پنجاب میں کشت و خون کے واقعات کے بارے میں سن سن کر، بھارت کے رویہ کو دیکھ دیکھ کر یہ خیال مستحکم ہوتا گیا کہ پاکستان سے ہماری زندگی اور سلامتی وابستہ ہے۔ لیکن ابھی تک یہ جذبہ خام تھا۔ یہ جذبہ حفظ ماتقدم کیلئے تھا۔ اپنی ذات کیلئے محدود تھا۔ ضرورت وقتی کی پیداوار تھا۔ بھارت کے طرز عمل کا ردعمل تھا۔ یہ جذبہ اسلام کی عظمت کا حامل نہ تھا۔

آٹھ سال گزر گئے۔ اس عرصہ میں ایک ایسے ادیب سے میری راہ و رسم ہو گئی جو اسلامی جذبے سے سرشار تھا اور جس کی زندگی میں عملی طور پر اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ ایک روز میں اس کے پاس گیا تو وہاں ایک معمر آدمی خواجہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کئی ایک بار خواجہ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب کم گو تھے۔ اپنی بات کہنے کی بجائے دوسرے کی بات سننے کے عادی تھے۔ ذہین اور باریک بین تھے۔ دوسروں کی مدد کرنے کے دلدادہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راست گو تھے۔ ایک روز میرے دوست نے مجھے کہا کہ خواجہ صاحب اچھے بزرگ ہیں لیکن خواجہ صاحب میں بزرگوں کی کوئی خصوصیت دکھائی نہ دیتی تھی۔ میرے نزدیک بزرگ وہ ہوتے ہیں جو جٹا دھاری ہوں۔ جن کی ہر بات سے ذاتی اہمیت مترشح ہوتی ہو جو ڈائس بنا کر بیٹھنے کے عادی ہوں اور پندونصیحت سے شغف رکھتے ہوں۔ خواجہ صاحب میں کوئی بات بھی تو نہ تھی۔ ان کی گفتگو میں روحانیت کی طرف کوئی اشارہ نہ ہوتا تھا۔ بلکہ عام دنیاوی مسائل پر وہ بڑے زیرک انداز میں دنیاوی نقطہ

نظر سے بات کرنے کے عادی تھے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر میں نے خواجہ صاحب سے ملنا جلنا جاری رکھا ورنہ اگر مجھے ذرا بھی شبہ پڑ جاتا کہ وہ بزرگ ہیں اور روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں تو میں یقیناً ان سے پیچھے ہٹ جاتا۔ چونکہ مجھے رسمی بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

ایک روز قبرستان کی طرف جا نکلا۔ دیکھا کہ ایک معمولی سی چار دیواری کے اندر خواجہ صاحب ایک مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ میں رک گیا۔ فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب حسب دستور بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے کہیے کیا حال چال ہے۔ میں نے کہا جی کوئی خاص اچھا نہیں۔ بس غم کھا رہے ہیں۔ بولے کیوں۔ غم کس بات کا۔ میں نے کہا خواجہ صاحب پاکستان کا کیا بنے گا یہ کشتی تو ڈول رہی ہے۔ میں نے یہ بات تفریحاً کہہ دی تھی۔ یہ درست ہے کہ مجھے پاکستان کے ڈولنے کا احساس تھا لیکن پاکستان کیلئے کوئی خاص لگن میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

خواجہ صاحب میری بات سن کر دفعتاً سنجیدہ ہو گئے۔ مفتی صاحب، وہ بولے۔ پاکستان کا غم آپ کیوں کھاتے ہیں جب پاکستان کا غم کھانے کیلئے بڑی بڑی ہستیاں موجود ہیں۔ آپ کو اور مجھے غم کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ساعت کیلئے وہ رک گئے پھر بولے۔ اس بڈھے کو دیکھتے ہیں آپ۔ میں نے اس جانب دیکھا جدھر خواجہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ جس پر وہ ابھی ابھی فاتحہ پڑھ کر آئے تھے۔ خواجہ صاحب بولے اس بڈھے نے اپنی تمام تر زندگی قیام پاکستان کیلئے وقف کر دی تھی۔ یہ بوٹا اسی بڈھے کا لگایا ہوا ہے۔

مفتی صاحب، وہ مسکرا کر کہنے لگے "پاکستان کیلئے بہت عظیم ہستیاں کام کر رہی ہیں۔ آپ کیوں غم کھاتے ہیں"۔ تو پھر میں کیا کروں میں نے ازراہ مذاق کہا۔

آپ صرف اتنا کریں کہ ہر کام سے پہلے سوچیں کیا آپ پاکستان کے مفاد کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ آپ کا قدم پاکستان کے مفاد کے خلاف تو نہیں۔ اس میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔ پاکستان تو بہر صورت پھلے پھولے گا۔ اس کی بہار دیکھ کر لوگ عش عش کریں گے۔ انشاء اللہ۔

خواجہ صاحب کی بات سن کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ انہوں نے تو کبھی بڑ نہ ہانکی تھی۔ ان کی بات بڑی زیرک ہوتی جو عملی دنیا سے متعلق ہوتی تھی۔ وہ پیر پرستی کے حق میں نہ تھے۔ پھر وہ بڈھا کون تھا جس نے پاکستان کا بوٹا لگایا تھا۔ وہ بڑی ہستیاں کون تھیں جو پاکستان کا غم کھانے پر مامور تھیں۔۔۔ پاکستان میں کیا خصوصیت ہے کہ بڑی ہستیاں اس پر مامور ہوں۔ پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے اس میں ابھی تک کوئی اسلامی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی۔۔ اور اسلامی ملک تعداد میں بیسیوں ہیں۔ سب کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔۔۔ خواجہ صاحب کی بات مہمل نظر آتی تھی۔ بات کی طرف توجہ کرتا تو وہ بے معنی معلوم ہوتی۔ خواجہ صاحب کے کردار کی طرف نظر جاتی تو از سر نو شش و پنج میں پڑ جاتا۔ خواجہ صاحب کی زیرکی۔ ان کی راست گوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

خواجہ صاحب میں ایک عجیب سی خصوصیت تھی۔ جب بھی وہ اللہ کا نام لیتے تو کچھ ایسے انداز میں بات کرتے جیسے اللہ ان کے پاس بیٹھا ہو۔ اور اللہ کا ایک خصوصی پروگرام ہو اور وہ کن کہہ کر تخلیق کرنے کے بعد آرام سے بیٹھ کر حقہ پینے والا اللہ نہ ہو۔ بلکہ ہر لمحے محنت مشقت اور مزدوری کرنے والا اللہ ہو۔ جس کے ہاتھ محنت کرتے کرتے بھدے اور کھردرے ہو چکے ہوں۔ اور جو ہر بات میں دوسروں کا ہاتھ بٹانے کا دلدادہ ہو۔ ان کی یہ بات مجھے کھلتی تھی۔ خواجہ صاحب نے اللہ کو مزدور بنا رکھا تھا۔

اللہ کا میں نوجوانی ہی سے بڑا قائل تھا۔ میرے ذہن میں اللہ کی دو خصوصیات نمایاں تھیں۔ عظمت اور بے نیازی۔ اللہ کی عظمت کا احساس فلکیات اور طب کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا اور اس کی بے نیازی میرا اپنا تاثر تھا۔ میں اسے رب العٰلمین سمجھتا تھا۔ رب المسلمین نہیں۔ میرے نزدیک اللہ ایک عظیم شہنشاہ تھا جس کی ریاست سیکلر (Secular) تھی۔ اسلام میرے نزدیک ایک ضابطہ عمل تھا۔ جو صرف بنی نوع انسان کیلئے باعث فلاح تھا جس کیلئے اللہ کو اپنے طرز عمل میں ردوبدل گوارا نہ تھا۔ میرے اللہ کو افراد سے دلچسپی نہ تھی۔

مذہب کے نقطہ نظر سے رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پھر پاکستان کی امتیازی حیثیت کے کیا معنے ساری بات ہی بے ہنگم تھی۔۔۔ اس کے باوجود چونکہ وہ بات خواجہ صاحب نے کی تھی۔۔۔ میرے دل میں گومگو کا عالم پیدا ہو گیا۔ دل میں ایک پھانس سی لگ گئی۔

پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یہ پہلا تذکرہ تھا۔

چار سال بیت گئے۔

میرا تبادلہ ہو گیا۔ ایک خصوصی محکمہ میں۔ مجھے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میرے نئے افسر میں چند ایک خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا۔ کم گو تھا۔ اس میں برداشت کا عنصر اس قدر زیادہ تھا کہ دیکھنے والے کو غصہ آجاتا اور اس میں ذات کا خیال قطعی طور پر مفقود تھا۔

صاحب نے مجھے بلایا۔ بولا آپ کام شروع کر دیں میں نے کہا یس سر۔ بولا اس صندوقچی میں پچھلے ہفتے کے خطوط ہیں۔ ان سب خطوط کو غور سے پڑھیں۔ موضوع کے لحاظ سے کلاسیفائی (Classify) کریں اور ایک سمری (Summary) بنا دیں۔ جو خط خصوصی توجہ کے قابل ہو اُسے الگ کر دیں۔ یس سر، میں نے کہا۔ چپڑاسی صندوقچی لے آئے گا۔ صاحب نے کہا۔ آل رائٹ سر۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے پہلا اس خط کھولا۔ لکھا تھا، "اے شاہ تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تجھے پاکستان کی بادشاہی کی عزت ملی"۔ خط پڑھ کر میں سوچنے لگا عجیب خط ہے۔ دوسرا خط کھولا تو اور بھی حیران ہوا۔ لکھا تھا، "خبردار دیکھ پاکستان میں آٹا مہنگا نہ ہونے دیجئو"۔ تیسرے خط میں لکھا تھا "وہ وقت دور نہیں جب پاکستان میں ایسا عالم ہو گا کہ مدینے کے رہنے والے دیکھ کر کہیں گے سبحان اللہ، سبحان اللہ"۔

ان خطوط کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے یہ خط کیوں لکھے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا۔ بہر طور ایک بات واضح تھی کہ لکھنے والوں کا مقصد نہ تو حاکم کی مدح سرائی تھی نہ اپنی طرف توجہ منعطف کرانا۔ نہ ہی ان خطوط میں ذاتی مفاد یا حاجت روائی کا

مذہب کے نقطہ نظر سے رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پھر پاکستان کی امتیازی حیثیت کے کیا معنے ساری بات ہی بے ہنگم تھی۔۔۔۔ اس کے باوجود چونکہ وہ بات خواجہ صاحب نے کی تھی۔۔۔ میرے دل میں گو مگو کا عالم پیدا ہو گیا۔ دل میں ایک پھانس سی لگ گئی۔

پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یہ پہلا تذکرہ تھا۔

چار سال بیت گئے۔

میرا تبادلہ ہو گیا۔ ایک خصوصی محکمہ میں۔ مجھے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میرے نئے افسر میں چند ایک خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا۔ کم گو تھا۔ اس میں برداشت کا عنصر اس قدر زیادہ تھا کہ دیکھنے والے کو غصہ آجاتا اور اس میں ذات کا خیال قطعی طور پر مفقود تھا۔

صاحب نے مجھے بلایا۔ بولا آپ کام شروع کر دیں میں نے کہا یس سر۔ بولا اس صندوقچی میں پچھلے ہفتے کے خطوط ہیں۔ ان سب خطوط کو غور سے پڑھیں۔ موضوع کے لحاظ سے کلاسیفائی (Classify) کریں اور ایک سمری (Summary) بنا دیں۔ جو خط خصوصی توجہ کے قابل ہو اسے الگ کر دیں۔ یس سر، میں نے کہا۔ چپڑاسی صندوقچی لے آئے گا۔ صاحب نے کہا۔ آل رائٹ سر۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے پہلا اس خط کھولا۔ لکھا تھا، ''اے شاہ تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تجھے پاکستان کی بادشاہی کی عزت ملی''۔ خط پڑھ کر میں سوچنے لگا عجیب خط ہے۔ دوسرا خط کھولا تو اور بھی حیران ہوا۔ لکھا تھا، ''خبردار دیکھو پاکستان میں آٹا مہنگا نہ ہونے دیجئیو''۔ تیسرے خط میں لکھا تھا ''وہ وقت دور نہیں جب پاکستان میں ایسا عالم ہوگا کہ مدینے کے رہنے والے دیکھ کر کہیں گے سبحان اللہ، سبحان اللہ''۔

ان خطوط کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے یہ خط کیوں لکھے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا۔ بہر طور ایک بات واضح تھی کہ لکھنے والوں کا مقصد نہ تو حاکم کی مدح سرائی تھی نہ اپنی طرف توجہ منعطف کرانا۔ نہ ہی ان خطوط میں ذاتی مفاد یا حاجت روائی کا

تذکرہ تھا۔ زیادہ تر خطوں میں لکھنے والوں کے نام بھی مرقوم نہ تھے۔ یہ خط دعا گو خادم یا عاجز پر ختم ہوتے تھے۔ بیشتر خطوط کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے تھے۔ تحریر اور انداز بیان دونوں ہی خام تھے۔ اثر ڈالنے کا عنصر مفقود تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے پیسے کیوں خرچ کئے تھے۔ وقت کیوں صرف کیا تھا۔

پھر میں نے ایک طویل خط اٹھایا۔ یہ خط جنوبی ہند کے کسی شہر ملائم سے موصول ہوا تھا۔ لکھنے والا سب جج تھا جو ۲۰ سال پیشتر ایک حادثہ کی وجہ سے اپاہج ہو چکا تھا اور گذشتہ بیس برس سے صاحبِ فراش تھا۔ ان بیس برسوں میں اس کا واحد کام عبادت تھا۔ طوالت کے باوجود خط کا لب لباب یہ تھا کہ میں یہ خط تمہارے لئے نہیں لکھ رہا بلکہ پاکستان کیلئے لکھ رہا ہوں۔ جلد ہی پاکستان ایک عظیم مملکت بن جائے گا۔ ایک عظیم فتح حاصل ہو گی اور پھر پاکستان دنیائے اسلام کا ایک عظیم مرکز بن جائے گا۔

ان خطوط نے مجھے پاگل کر دیا۔ یہ کون سی دنیا تھی۔ یہ کس قسم کے لوگ تھے۔ خط لکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا۔ کیا یہ سب مذہبی ہسٹیریا کے مریض تھے۔ مجذوب تھے یا (Wishful Thinkers) تھے۔ لیکن ان میں کئی ایک خطوط پڑھے لکھے لوگوں کے بھی تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ان خطوط میں کسی فرد کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ کسی فرد کی توقیر و تعظیم نہ ملتی تھی۔ یہ خط قصیدہ گوئی سے خالی تھے۔ ان خطوط میں کسی ظلِ الٰہی کو خطاب نہ کیا گیا تھا۔ ان کا موضوع پاکستان تھا۔ پاکستان کی خصوصی عظمت۔ پاکستان سے رسول اللہ کا التفات پاکستان پر اللہ کی برکت و رحمت۔۔۔ ان خطوط کو پڑھ کر میں پاگل ہو گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی وحشت سوار ہو گئی۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ لوگ کون لوگ ہیں؟ یہ دنیا کونسی دنیا ہے؟ پاکستان کیا ہے۔ اسے کیا امتیاز حاصل ہے؟ کیوں حاصل ہے؟

طبعیت کے لحاظ سے میں بنیادی طور پر ایک مجذوب واقع ہوا ہوں۔ عام حالات میں مجھ پر کسی واقعہ کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن جب اثر ہو جائے تو میں شل ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے اندر لاوا کھولنے لگتا ہے اور پھر گویا آتش فشاں جاگ اٹھتا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر پہلے

تو میں سوچتا رہا پھر نہ جانے کیا ہوا۔ گویا عقل و خرد کے دونوں کنارے ٹوٹ گئے جذبے کا دھارا بہہ نکلا اور میری ناؤ ڈگمگانے لگی۔

دو روز میں دیوانوں کی طرح اپنے گھر میں صحرانوردی کرتا رہا طوفان تھما تو میں پھر سے سوچنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صاحب سے مل کر کہوں کہ جناب عالی یہ خط میرے بس کا روگ نہیں۔ مجھے کوئی سنجیدہ کام دیجئے جسے عقل سے تعلق ہو۔

تیسرے روز میں تیار بیٹھا تھا کہ جب بھی صاحب اکیلا ہو تو میں جا کر اس سے بات کروں۔ عین اس وقت صاحب کا چپڑاسی آ گیا میں نے سوچا چلو اچھا ہوا اس سے کہہ دیتا ہوں کہ صاحب اکیلا ہو تو مجھے اطلاع کر دے۔ چپڑاسی نے آکر کہا جی صاحب بلاتے ہیں۔ صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے سوچا کہ صاحب اپنی بات کر لے تو پھر میں اپنی درخواست پیش کروں گا۔

اس وقت صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ آپ گیٹ پر سیکورٹی کے کمرے میں چلے جائیں۔ وہاں ایک شخص مجھ سے ملنے کیلئے مصر ہے آپ اس سے بات کریں کہیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ اگر وہ آپ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس سے بات پوچھ لیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر وہ مجھ سے ملنے پر مصر رہے تو اسے جانے نہ دیں بلکہ مجھے اطلاع دیں۔۔۔ میں اس سے ملوں گا۔

یس سر۔۔۔ صاحب کی بات سن کر میں دروازے کی طرف مڑا۔ اور دیکھئے، صاحب بولا، سیکورٹی کے کمرے میں بات نہ کریں۔ اسے باہر لے جائیں۔ علیحدگی میں، سمجھے۔

یس سر۔۔۔ اس وقت صاحب سے اپنی بات کہنے کا موقع نہ تھا۔ میں نے سوچا واپسی پر بات کروں گا۔

سیکورٹی کے کمرے میں ایک دہقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اسے باہر باغیچے میں لے گیا۔ صاحب کام میں مصروف ہیں انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر آپ یہ بتائیں کہ آپ انہیں کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو۔۔۔۔۔۔ میں ابھی جملہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ بولا۔ بابو جی میں نے صاحب سے مل کر کیا لینا ہے۔ مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں نہ ہی میں اسے جانتا ہوں۔ میں اپنے گاؤں سے آ رہا تھا۔ اس سڑک کے پاس مجھے ایک سانڈھنی سوار ملا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں پاس گیا تو وہ کہنے لگا میاں اس مکان کے اندر جاؤ۔ صاحب سے ملو اور ہمارا ایک پیغام اسے دیدو۔ سانڈھنی سوار ایک بزرگ آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ادھر آ گیا۔ لیکن یہ پولیس والے دوسرے کی بات ہی نہیں سنتے اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔

میں نے کہا آپ مجھے پیغام دے دیں میں صاحب تک پہنچا دوں گا۔ سانڈھنی سوار نے مجھ سے کہا، وہ بولا، جا کر اسے کہہ دو کہ جو کاغذ وہ لکھ رہا ہے وہ غلط ہے اور جو وہ لکھ کر پھاڑ چکا ہے وہ صحیح ہے۔

عجیب مہمل سا پیغام ہے میں نے سوچا۔ نہ سر نہ پاؤں۔ سانڈھنی سوار کو صاحب کے نوٹ سے کیا واسطہ، اور سانڈھنی سوار یہاں کہاں۔ میں نے تو کبھی اس علاقے میں کوئی سانڈھنی سوار نہیں دیکھا یقیناً یہ دہقان پاگل ہے۔

مجھے یقین تھا کہ صاحب بات سن کر مسکرا دے گا اور پھر کام میں مصروف ہو جائے گا۔ لیکن بات سن کر ایک ساعت کیلئے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ذرا یہ ویسٹ پیپر باسکٹ تو اٹھایئے۔ میں نے ٹوکری اٹھا کر میز پر رکھ دی۔ وہ بڑی توجہ اور احتیاط سے کاغذ کے ٹکڑے ٹوکری میں سے چننے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت سی ہوئی۔ کیا صاحب سانڈھنی سوار کی بات سچ مان بیٹھا ہے۔

صاحب نے وہ پرزے میری جانب بڑھا دیئے، بولا اگر آپ کو فرصت ہو تو ذرا انہیں جوڑ دیجئے۔ یس سر، میں نے کہا، صاحب نے وہ نوٹ اٹھا لیا جو وہ لکھ رہا تھا اور اسے پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ شخص جو اس قدر ذہین اور زیرک ہے کہ ہم ابھی بات کرنے کیلئے منہ کھولتے ہیں تو ہمارا عندیہ بھانپ جاتا ہے۔ یہ شخص جو ہر ایک کی بات سننے کے باوجود اپنی رائے رکھتا ہے۔ جس کے خیالات میں انفرادیت اور ندرت ہے۔ جو پٹے ہوئے رسمی خیالات سے دور رہتا ہے۔ جسے (Fanaticism) سے دور کا واسطہ بھی

نہیں۔ یہ شخص ایک مبہم ساؤنڈ ھنی سوار کی بات کو یوں اپنا رہا ہے جیسے ہمیشہ ہی سے ایسے ساؤنڈ ھنی سواروں سے واسطہ رہا ہو۔ جیسے اس قسم کے پیغامات سے مانوس ہو، یہ کیا بھید ہے۔

میں نے کاغذ کے پرزے جوڑے۔ وہ نوٹ پاکستان کے مجوزہ آئین کی ایک شق تھی جسے اسلام سے تعلق تھا۔ اس کے بعد صاحب سے خطوں کی بات کرنا بے معنی نظر آنے لگا اور میں از سر نو ان خطوں کی الف لیلیٰ میں کھو گیا۔ وہ خط روز موصول ہوتے تھے۔ لیکن عام طور پر ان کا موضوع ایک ہی ہوتا۔ پاکستان، پاکستان کا امتیاز، پاکستان کی آنے والی عظمت، درخشندہ مستقبل۔۔۔ آہستہ آہستہ میں اس طوفان میں بہہ گیا۔۔۔ میرے دل میں خیال پیدا ہونے لگا کہ شاید یہ چوتھی سمت بھی حقیقت ہو۔ شاید اللہ میاں کسی ملک یا فرد میں خصوصی دلچسپی لینے سے گریز نہ کرتے ہوں۔ آخر وہ مالک ارض و سما ہیں اگر وہ کوئی بات کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔

ایک روز صاحب نے مجھے بلایا اور ایک کام دے کر اپنے ہی کمرے میں بٹھا لیا تاکہ وہیں بیٹھ کر ختم کر دوں۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا کہ چپڑاسی آیا صاحب سے کہنے لگا، سر میرا ایک چچا اب کی بار حج کرنے گیا تھا۔ وہ مدینہ شریف سے آپ کیلئے ایک پیغام لایا ہے حکم ہو تو اسے بلا لوں۔

صاحب نے بڑی سنجیدگی سے چپڑاسی کی بات سنی بولا بلا لو۔ اس نے اپنا کام ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھ کر بڈھے سے مصافحہ کیا اور بڑے غور اور احترام سے بڈھے کی بات سننے لگا۔

تمہید کے بعد بڈھے نے کہا، جناب وہ جہلم کے رہنے والے ہیں۔ فوج میں سپاہی تھے۔ بڑی جنگ میں لام پر گئے تھے۔ وہاں سے مدینہ شریف میں سلام کیلئے حاضر ہوئے۔ بس وہیں بیٹھ گئے۔ آج تک وہیں بیٹھے ہیں۔ اب وہ جالی بردار ہیں۔ یہ بہت بڑا عہدہ ہے جناب۔

صاحب نے سر اثبات میں ہلایا۔

بڈھے نے بات شروع کی۔ انہوں نے فرمایا کہ سن ۱۹۴۶ء میں ہم نے خواب دیکھا کہ مسجد نبوی سے ایک بیل پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے دور نکل گئی اور اس کے پرلے سرے پر سبز پتیاں نکل آئیں۔

صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

چار ایک سال کے بعد خواب میں پھر اسی بیل کو دیکھا۔ شاخ جوں کی توں قائم تھی لیکن پتیاں مرجھا گئی تھیں۔۔۔۔۔ اب پھر خواب میں ہم نے وہی بیل دیکھی ہے۔ وہ پھر سے سرسبز ہو رہی ہے پھر سے کونپلیں نکل رہی ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا ہماری طرف سے جا کر مبارکباد دینا اور کہنا یہ پیغام پہنچا دو کہ بھیڑوں کے رکھوالے خود سائے میں نہیں بیٹھتے۔

جب تک وہ بڈھا بات کرتا رہا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ جب اس نے کہا۔ ہماری طرف سے مبارکباد دینا تو میں نے محسوس کیا جیسے مبارکباد مجھے دی جا رہی ہو۔ اس روز مجھے پاکستان کا ہر بوٹا مزید ہرا بھرا نظر آنے لگا اور ہر سوکھی شاخ سے نئی کونپلیں پھوٹتی نظر آنے لگیں۔ لاکھ لاحول پڑھتا۔ اپنے آپ کو قائم کرنے کی کوشش کرتا لیکن بے سود۔ الف لیلیٰ کی اس دنیا میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ عجب نشہ تھا۔ میری عقل مجھے ملامت کرتی لیکن مجھے اس نشے کی لت پڑ رہی تھی۔

پھر اللہ میاں میرے روبرو ایک سٹول پر آ بیٹھے۔ ان کے ہاتھوں میں اوزار تھے وہ کام میں منہمک تھے۔ محنت کے پسینے سے شرابور تھے ان کے ہاتھ کام کرتے کرتے کھردرے ہو گئے تھے۔ وہ تعمیر میں منہمک تھے۔ پاکستان کی تعمیر۔ یہ میرے اللہ میاں تو نہ تھے یہ تو خواجہ صاحب کے اللہ میاں تھے۔ میرے اللہ میاں جو دور بہت دور اوپر بہت اوپر تخت پر بیٹھ کر کن کہا کرتے تھے۔ جو عظیم تھے، بے نیاز تھے، دور تھے اونچے تھے وہ اللہ میاں پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جسے دیکھ کر میرا بند بند لرز گیا خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ صاحب کے ایک دوست نے فون کیا، کہنے لگا ایک درویش آئے ہیں، پہلے یہ حیدر آباد میں آئی جی پولیس تھے پھر بلاوہ آ گیا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو گئے بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ ملنا چاہیں تو میرے ہاں آ جائیں۔

صاحب درویش سے ملنے جانے لگا تو مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ اس درویش کی شکل بڑی ڈراونی تھی۔ سیاہ رنگ، ہڈیوں کا ڈھانچہ، خوفناک آنکھیں، کرخت آواز، صاحب کا تعارف کرانے کے بعد صاحب خانہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور صاحب اور وہ درویش جو مجھے سڑی ہوئی مرچ دکھائی دے رہا تھا اکیلے رہ گئے۔ میں ملحقہ کمرے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔

دفعتاً اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا ملحقہ کمرے میں مرچ انگریزی بول رہا تھا، کہہ رہا تھا، (Flay you alive put bran on you and place you in the sun)

ارے یہ کیا صاحب سے کہہ رہا ہے یہ درویش ہے یا قصائی۔

"میں صرف اس مقصد کیلئے آیا ہوں"۔ اس کی کرخت آواز پھر گونجی "کہ تمہیں وارننگ دوں، تمہیں پتہ ہے کہ اس سلسلے میں وارننگ نہیں دی جاتی جو کوتاہی کرے اسے ہٹادیا جاتا ہے، رد کر دیا جاتا ہے، لیکن پاکستان کو خصوصی رعایت حاصل ہے۔ اس لئے وارننگ دی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی کوتاہی ہوئی تو کھال ادھیڑ دی جائے گی اور نمک لگا کر دھوپ میں رکھ دیا جائے گا"۔

اتنی بات سن کر خوف سے میرا خون جم گیا اور میں دیوانہ وار باہر نکل گیا۔ تین گھنٹے صاحب اور مرچ اس کمرے میں بند رہے۔

جب صاحب باہر نکلا تو اس کا منہ زرد تھا جیسے تمام خون چوس لیا گیا ہو۔ وہ بصد مشکل چل رہا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

دو سال بعد ایسی ہی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہوا۔ صاحب اور میں دورے پر کراچی گئے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم سنٹرل جیل گئے۔ صاحب کو وہاں کچھ کام تھا۔ ابھی وہ کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے آکر سلوٹ مارا۔ بولا حضور ایک قیدی آپ کا نام لے لے کر پکار رہا ہے، کہتا ہے اسے بلاؤ۔

ہم اس گارڈ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ایک چھوٹے سلاخ دار کمرے میں ایک ہیجڑا بند تھا۔ صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ تالا کھولو صاحب بولا۔ تالا کھلا تو وہ اندر داخل ہو گیا اور گارڈ سے کہنے لگا تم جاؤ۔ میں اوٹ میں کھڑا رہا۔

ہیجڑے نے صاحب کو دیکھتے ہی چلا کر غصے میں کہا، تجھے خبردار کرنے کیلئے ہمیں قید ہونا پڑا۔۔۔

یہ سنتے ہی مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہاں سے بھاگا۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب صاحب وہاں سے نکلا تو اس کی وہی حالت تھی جیسے مرچ سے ملاقات کرنے کے بعد ہوئی تھی۔

یا اللہ یہ کیا اسرار ہے میرے ذہن میں پھر سے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اگلے روز میں اکیلا جیل پہنچا لیکن وہ قیدی وہاں نہیں تھا۔ میں نے ادھر ادھر سے اس کے کوائف پوچھے تو پتہ چلا کہ وہ باقاعدہ قیدی نہ تھا۔ جیل کے قریبی بازار میں دنگا کر رہا تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے لا کر اسے کمرے میں بند کر دیا۔ صاحب کے جانے کے بعد اس کے کمرے کو مقفل کر دیا گیا تھا۔ کسی گارڈ کو علم نہ تھا کہ کس نے اسے رہا کیا۔ ان واقعات نے مجھے پاگل کر دیا۔ پاکستان کی امتیازی حیثیت کا بھید اور بھی پراسرار ہو گیا۔۔۔ لیکن ان جانے میں مجھے پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یقین ہو گیا۔ چوتھی سمت کی بات میرے لئے عجوبہ نہ رہی۔ اور اللہ میاں اپنے مشقت زدہ ہاتھوں سے پاکستان میں جگہ جگہ اینٹیں رکھتے ہوئے نظر آنے لگے۔

پھر میرا تبادلہ ہو گیا اور میری خدمات ایک اور محکمہ کو پیش کر دی گئیں۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ گاہے گاہے بیٹھے بٹھائے مجھے وہ دور یاد آ جاتا۔ میرے جسم پر چیونٹے سے رینگتے اور ایک عجیب کیفیت مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ سانپ گزر گیا تھا لیکن لکیریں باقی تھیں اور وہ لکیریں روز بروز روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ان لکیروں نے گویا زبردستی میرا زاویہ نگاہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود ذہنی طور پر میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا۔ میری کیفیت اس کتے کی سی تھی جو نہ گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ پاکستان کیلئے میرے دل میں ایک عقیدت سی پیدا ہو چکی تھی۔ میں پاکستانی ہونے پر ناز محسوس کرنے لگا تھا۔ اور پاکستان کے مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھائے انتظار کر رہا تھا۔۔۔ کس کا انتظار۔۔۔ یہ مجھے علم نہیں۔

اس زمانے میں اتفاق سے تبتی ثقافت سے متعلق ایک کتاب میرے ہاتھ لگی۔ اسے پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ تبت کے راہوں میں بھی ایک پراسرار عنصر موجود ہے۔ اس پراسرار عنصر کی تفصیلات جاننے کیلئے میرے دل میں شوق پیدا ہوا میں نے بہت سی کتابیں ڈھونڈ نکالیں۔ ان کے مطالعہ سے مجھے حیرت ہوئی۔ چونکہ ان میں چوتھی سمت کا تذکرہ عام تھا اور لاما لوگ چوتھی سمت کو مادی زندگی کا ایک حصہ سمجھنے پر مصر تھے۔ ان کے خیال کے مطابق اس پر بھی مادی اصول حاوی تھے۔ میرے لئے یہ ایک انوکھی بات تھی۔ لیکن اس کے باوجود پاکستان کی امتیازی خصوصیات کا عقدہ حل نہ ہوا۔

ایک روز جب میں اسلام آباد کے گردونواح میں گھوم رہا تھا ایک ٹیکسی میرے قریب آکر رک گئی۔ میرے ایک پرانے دوست احمد نے ٹیکسی سے سر نکالا۔ اسے دیکھ کر میں چلایا، "ارے تم تو یورپ گئے ہوئے تھے"۔ "میں اسی ہفتے واپس آیا ہوں" احمد بولا۔ "یہاں کیسے گھوم رہے ہو" میں نے پوچھا۔ "بری شاہ لطیف جا رہا ہوں" وہ بولا۔ احمد کی زبان سے شاہ لطیف کا نام سن کر مجھے حیرت ہوئی چونکہ احمد تہذیب جدید کی پیداوار تھا۔ تم وہاں جا کر کیا کرو گے میں نے پوچھا۔ آؤ یار وہ بولا، میرے ساتھ چلو، ابھی واپس آجائیں گے۔

جب ہم مزار پر پہنچے تو فاتحہ خوانی کے بعد احمد بولا۔ یار بڑی حیرت کی بات ہے، کیا لوگ اس قدر صاحبِ نظر ہوتے ہیں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں یورپ کی متعدد لائبریوں میں گیا۔ وہاں ایک نسخہ ملا جس میں درج تھا کہ بری شاہ لطیف نے نہ جانے کتنے سو سال پہلے فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک ایک اسلامی شہر آباد ہوگا جو دنیائے اسلام کا مرکز بنے گا۔ اور یہ نسخہ دو سو سال پرانا تھا۔ دیکھ لو اسلام آباد نور پور سے ایک آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ صرف آدھ میل، حد ہو گئی۔

جب ہم نور پور سے واپس آرہے تھے تو ٹیکسی رک گئی۔ کیوں بھائی رک کیوں گئے، احمد نے پوچھا۔ ڈرائیور بولا جناب نور پور کی سڑک یہاں سے توڑ دی گئی ہے ہم نے باہر دیکھا، سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ دس پندرہ گز کا ٹکڑا کچا تھا۔ احمد نے قہقہہ لگایا بولا مفتی دیکھ لو اسلام آباد

نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ بری شاہ لطیف کو جانے والی سڑک کاٹ دی ہے اور یہ شہر دنیائے اسلام کا مرکز بننے والا ہے۔ اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

"نور پور کے تانگے کو اسلام آباد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔ "سنتے ہو" احمد پھر ہنسنے لگا۔

پھر جنگ چھڑ گئی، بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ عجیب و غریب نوعیت کی خبریں آنے لگیں۔ یہ خبریں مافوق الفطرت عنصر سے بھری ہوئی تھیں۔ قدم قدم پر معجزات کے تذکرے تھے۔ اخباروں کے کالم ایسے بیانات سے بھرے ہوئے تھے لوگ ان خبروں کو سنتے اور سر دھنتے تھے۔

حضور اعلیٰ سرورِ دوعالم عجلت میں گھوڑے پر سوار ہو کر پاکستان کے جہاد میں شامل ہونے کیلئے تشریف لا رہے تھے۔ جنگ بدر کے شہدا محاذوں پر پہنچ چکے تھے۔ حضرت علی امام حسن اور امام حسین سفید ملبوسات پہنے سیالکوٹ کے قرب و جوار میں محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ ایک محاذ کے بھارتی قیدی کا بیان تھا کہ سفید پیراہن والی پاکستانی فوج بھارتیوں کو تہس نہس کر رہی تھی۔ ان کی تلواروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دوسرے محاذ کے قیدی کا بیان تھا کہ سرخ ٹوپیوں اور چھوٹے قد والے پاکستانی فوجیوں نے بھارتی سینا کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ بھارتی توپچی نے کہا گولے پھینکنا بے کار تھا۔ ایک سفید ریش بڈھا میرے گولے کیچ کر کے پرے پھینک دیتا تھا۔ بھارتی ہوابازوں کا بیان تھا کہ جب وہ گولے پھینکتے تھے تو سفید ریش بڈھے انہیں ہاتھوں میں پکڑ کر زمین پر یوں رکھ دیتے کہ وہ پھٹتے نہ تھے۔

سارا پاکستان ان معجزوں سے گونج رہا تھا۔

ایک دانشور نے تحقیر بھرا قہقہہ لگایا "یار یہ پاکستانی عوام معجزے گھڑنے میں کمال رکھتے ہیں۔۔۔۔ آج کل ایسا ایسا معجزہ ایجاد ہو رہا ہے جس کا جواب نہیں"۔

"لیکن۔۔۔۔ دوسرا بولا۔۔۔ "یار اگر ان معجزوں سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں بات سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات نہیں بنتی"۔

"کیا مطلب"؟ تیسرے نے کہا۔

"مطلب یہ کہ اگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو۔۔۔۔ ہمیں جنگ ہار جانی چاہیے تھی اور بھارت کو پاکستان پر قابض ہو جانا چاہیے تھا"۔

"ہاں" ایک اور دانشور بولا "بھارتی حملے کا پلان فوجی اصولوں کے لحاظ سے عین پریکٹیکل تھا اس میں کوئی سقم نہ تھا"۔

"لیکن یہ مافوق الفطرت داستانیں چھوڑو یار"۔ ایک نے کہا "خالص جدت طرازی" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

"لیکن یار" ایک رپورٹر بولا "یہ باتیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں"۔

"دو ایک باتیں ہر ایک نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں" پہلے دانشور نے تضحیک بھرا قہقہہ لگایا۔

میں ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا لیکن مجھے کچھ کہنے کی جرات نہ پڑی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان سب کے دلوں میں ایک ضدی لیکن۔۔۔۔ ابھرتا ہے اور وہ اسے بھولنے کیلئے قہقہوں کا سہارا لے رہے ہیں۔

جنگ نے پاکستان کے معمے کو از سر نو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن اب مجھ میں (Resistance) کی طاقت نہ رہی تھی۔ اب مجھ میں اس بات کو شدت سے رد کرنے کی ہمت نہ رہی تھی جسے میں اپنی عقل و خرد کے مطابق سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے دوران محیر العقل باتوں نے پاکستان کی امتیازی حیثیت پر مہر لگا دی تھی۔ اب میرا اللہ سٹول پر بیٹھ کر اینٹیں نہیں رکھ رہا تھا وہ سفید گھوڑے پر سوار تھا اس کے ہاتھ میں ایک لمبی زنگ آلود تلوار تھی وہ پاکستان کے محاذوں پر گشت کر رہا تھا اور اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔

جنگ کے دوران میرا ایک ہم کار مجھ سے ملنے آیا۔ ملاقات کے بعد میں نے پوچھا کیا گھر جاؤ گے۔ بولا نہیں۔ قاضی صاحب سے مل کر گھر جاؤں گا۔ میں نے پوچھا وہ کون ہیں۔ بولا وہ ایک عابد آدمی ہیں بہت اچھے لوگ ہیں۔ میں نے کہا مجھے بھی لے چلو۔

قاضی صاحب کے کمرے میں جا بجا مکہ مدینہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جائے نماز پر تسبیحیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ہمیں بڑے اخلاق سے ملے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے آپ بھی کوئی بات کریں۔

میں نے کہا جی پاکستان کیلئے دعا فرمائیں۔

دفعتاً وہ سنجیدہ ہو گئے۔ بولے میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ بہت چھوٹا آدمی ہوں، میری کیا حیثیت ہے کہ میں پاکستان کیلئے دعا کروں۔ نہیں مفتی صاحب میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں۔

میں نے کہا جناب قاضی صاحب دعا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔

وہ بولے ٹھیک ہے لیکن پاکستان کی اور بات ہے۔ آپ کو پتہ نہیں۔ مجھے بھی تھوڑی سی خبر ہے بہت تھوڑی۔ میں چھوٹا آدمی ہوں بہت چھوٹا۔ پاکستان پر بڑوں کا ہاتھ ہے۔ بہت بہت بڑے جو ہیں ان کا۔۔۔۔ وہ پاکستان کے محافظ ہیں۔ اس کے نگہبان ہیں آپ پاکستان کا فکر نہ کریں۔

قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا۔ یا اللہ یہ بڑے لوگ کون ہیں۔ کیا وہی ہیں جو سیالکوٹ کے گرد و نواح میں سفید پیراہن پہنے دیکھے گئے تھے۔

کیا یہ وہی تھے جو بھارتی توپچیوں کے گولے کیچ کرتے تھے۔ ہوائی جہازوں سے گرائے ہوئے بموں کو اٹھا اٹھا کر دور پھینکتے تھے۔ کیا انہی بڑوں میں سے کسی نے بھارتی پائلٹ کی نظر بندی کر دی تھی اور اسے دریائے راوی پر چھ پل نظر آنے لگے تھے۔ کیا انہوں نے ہی بھارتی پائلٹ کو حکم دیا تھا "بیل آوٹ، بیل آوٹ" اور وہ پاکستانی مزاحمت کے بغیر بڑوں کی آوازیں سن سن کر گھبرا کر بیل آوٹ کر گیا تھا۔

کیا پاکستان کے لیڈروں کو اس بات کا شعور ہے کہ قدم قدم پر بڑے پاکستان کی امداد کر رہے ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ پاکستان کی مثالی ترقی میں ہماری جد و جہد کو ان

نتائج سے کیا مناسبت ہے۔ جو بظاہر ہماری کوششیں پیدا کر رہی ہیں۔ کیا انہیں اس حقیقت کا شعور ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جو مقام پاکستان کو حاصل ہوا ہے وہ کس کا مرہون منت ہے۔ کیا پاکستان کے سربراہوں کو کبھی شک پڑا ہے کہ پاکستان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور کیا انہوں نے اس بات کی عملی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی کشتی کو کھے کر اس امتیازی حیثیت کی طرف لے جائیں۔ کیا انہوں نے ان بڑوں سے رابطہ پیدا کرنے کی خواہش محسوس کی ہے جو پاکستان کی فلاح وبہبود اور اس کے تحفظ کیلئے پیہم مصروف عمل ہیں۔

ہاں ۔۔۔ قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا۔

جنگ ختم ہو گئی تھی لیکن بھڑوں کا چھتہ ابھی تک بھن بھن کر رہا تھا۔ پھر سے جنگ ہونے کا خدشہ لگا ہوا تھا۔ قبرستان کے نزدیک ایک ننگ دھڑنگ مست اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ابھی کیا ہے ابھی تو خون کی ندیاں چلیں گی۔ بہت مریں گے بہت۔ لاشیں ہی لاشیں، پھر بڑی فتح ہو گی اور سبحان اللہ، سبحان اللہ، وہ جوش میں تالیاں بجا رہا تھا جیسے مجھے کوئی چڑا رہا ہو۔

خواجہ صاحب کو مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رک گیا۔

کیا حال ہے مفتی صاحب وہ بولے۔

فکر میں گھل رہا ہوں، خواجہ صاحب، میں نے کہا۔

کس کے فکر میں گھلنے لگے۔ انہوں نے پوچھا۔

پاکستان کا فکر لگا ہے، میں نے کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گئے ان کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ بولے مفتی جی اللہ کا کام اللہ کیلئے چھوڑ دو۔ اللہ کا کام اپنے ذمے نہ لو۔ پاکستان کا فکر کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں جی۔ آپ اپنی سوچئے۔ اپنے فرائض ادا کیجئے۔ یہ سوچئے کہ آپ پاکستان کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہے آپ جو پاکستان کے مفاد کے منافی ہو۔ پاکستان کا فکر نہ کھائیے ۔۔۔ پاکستان پر حضور اعلیٰ کا ہاتھ ہے۔ واہ مفتی جی اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ سکے۔

عزیز ملک

اور راولپنڈی لیس

عزیز ملک سے میں ۱۹۵۵ میں متعارف ہوا صرف رسمی میل جول ہی نہیں۔۔ بہت قریب سے اسے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

زندگی میں مجھے بہت سے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو ادب لکھتے ہیں لیکن بہت کم ایسے اصحاب ملے جو ادب بولتے تھے۔ اب سے پہلے میرٹھ میں ڈاکٹر صفدر حسین ملا لیکن ان دنوں وہ خالی صفدر حسین تھا اور سب سے آخر میں راولپنڈی میں عزیز ملک ملا۔ جو جب بھی عزیز ملک تھا اب بھی عزیز ملک ہے۔

عزیز ملک کی عام روزمرہ کی گفتگو ادبی رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ کسی واقعہ شخصیت منظر یا تاثر کو بیان کرتے ہوئے ان جانے میں عزیز ملک کا کلام ادبی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

عام طور سے عزیز ملک کو جاننے والے اس کے ادبی کلام سے واقف نہیں ہوتے چونکہ عزیز ملک گونگا ہے۔ وہ آپ کے روبرو روزمرہ قسم کی گفتگو کرنے سے بھی گریز کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عزیز ملک ازلی طور پر اکیلا ہے۔ اکیلا اور تنہا۔ عزیز ملک وہ پھول ہے جو اکیلے میں کھلتا ہے اور ناظر کی نگاہ پڑ جائے تو مرجھا جاتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ عزیز ملک کا ادبی کلام سنیں تو آپ کو اس کے اس قدر قریب جانا ہو گا کہ عزیز ملک کو آپ پر گمان ہونے لگے۔ کم از کم آپ کی موجودگی احساس غیرت نہ دلائے۔ بلکہ اس کے احساس تنہائی کو تقویت دے۔ پھر دیکھئے یہ بظاہر گونگا عزیز ملک کتنلا بولتا ہے۔ اس کی باتوں میں کتنا رنگ رس ہے اس کا مزاج کس قدر مفرح ہے۔ اس کی طنز کی دھار

میں کتنی کاٹ ہے۔ ان کا الفاظ کا چناؤ کتنا موزوں ہے۔

راول دیس کے مضامین عزیز ملک کے ادبی تخیل اور کلام کا ایک نمونہ ہیں مکمل تعویز نہیں چونکہ لکھتے لکھتے اسے شبہ پڑ جاتا ہے کہ آپ مضامین پڑھ لیں گے۔ تنہائی کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ مدوجزر اٹھتا ہے چھینٹے اڑتے ہیں جھاگ ابھرتا ہے۔

اکیلے ادیب کا المیہ بھی عجیب ہے وہ کہنے کو ترستا ہے۔ مگر سنانے سے ڈرتا ہے۔

اکیلا یا تو دیوانہ ہوتا ہے اور یا "تخلیقی" اور یا دونوں۔ عزیز ملک دونوں ہے۔ دیوانہ بھی، تخلیقی بھی۔ شاید تخلیق کی صلاحیت کی قیمت دیوانگی ہو کون جانتا ہے۔ شاید ان دونوں خصوصیات کی حیثیت دھوپ چھاؤں کے مترادف ہو۔ لیکن چھاؤں تو وجود ہی نہیں رکھتی۔ وہ تو دھوپ کی وقتی عدم موجودگی کا نام ہے۔

عزیز ملک نے تین چیزیں ورثہ میں پائیں یہ ورثہ مال و اسباب یا جائیداد کا ورثہ نہ تھا ملکیت تو تھی۔ مگر عزیز ملک کی نہیں بلکہ ورثہ کی تھی۔ عزیز ملک اس ورثہ کے ہاتھ یوں بے بس تھا جیسے بچے کے ہاتھ میں چڑیا ہو۔ یہ تین چیزیں عزیز ملک کی ہڈیوں میں جمی ہوئی ہیں۔

ایک طب دوسرے اسلام اور تیسرے ادب۔ طب اور اسلام براہِ راست والد صاحب نے عطا کیئے۔ ادب کسی دادا پردادا کی دین ہے۔

ممکن ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ڈربے میں ساتھ ساتھ پرورش پاتیں لیکن بدقسمتی سے بچپن میں کسمپرسی کے ماحول نے حفظِ ماتقدم کے تحت اسے مطالعہ میں پناہ لینے کی چاٹ ڈال دی۔ اور پیشتر اس کے کہ اسے احساس ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ طب اسلام اور ادب پر وسیع مطالعہ کر چکا تھا۔

اعتقاد کی شدت توارثی طور پر ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی۔

وسعتِ نگاہ مطالعہ نے عشق، دونوں سوکنیں ایک ہی گھر میں رہنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تو تو میں میں شروع ہوئی۔ برتن ٹوٹنے لگے۔ غل غپاڑہ ہوا۔ بے چارے میاں کیا کرتے۔ میاں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ آنکھیں موندھ لیں۔ اور یقین کر لیا کہ گھر میں

سب خیریت ہے۔ پھر بھی ان کی گردن لٹک گئی۔ کمر خمیدہ ہو گئی۔

آج بھی عزیز ملک کو سرِ راہ گزارتے ہوئے دیکھئے تنہا، مدمد، سر لٹکا ہوا، کمر خمیدہ، یوں نکل جائے گا جیسے کٹا ہوا پتنگ جس کا سر بوجھل ہو۔ اس کے باوجود عزیز ملک نے مطالعہ کی لت نہیں چھوڑی۔ آج بھی اس کا واحد شوق مطالعہ ہے۔ اسلام اور ادب کا مطالعہ بے مقصد پتہ نہیں ایسا کیوں ہے مگر ہے کہ ابتدائی دور میں مطالعہ شکوک و شبہات کو ہوا دیتا ہے۔ تخیل میں رنگ بھرتا ہے۔ عمل سے دور لے جاتا ہے ثانوی دور شکوک و شبہات کو صاف کرتا ہے تخیل اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو ثانوی دور تک پہنچ نہیں پاتے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جب تک پیدا نہ ہوں شکوک و شبہات دور نہیں ہو سکتے۔

شدتِ ایمان کے ورثہ کی وجہ سے مطالعہ کے اولین دور میں بھی عزیز ملک میں شکوک و شبہات نہ ابھرے اور نہ ابھر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ثانوی دور میں قدم رکھنے کے باوجود اس کے دل میں بے نام تذبذب کی گھٹن باقی رہی۔ اب بھی ہے۔

پرانے زمانے کی بات ہے۔ پنجاب کے کسی علاقے میں ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ ریاست میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اناج وافر تھا۔ زمین زرخیز تھی۔ لوگ خوشحال تھے۔

راجہ لوگوں کی خوشحالی پر پھولے نہ سماتا۔ لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھار بیٹھے بٹھائے راجہ کو شک پڑ جاتا کہ حالات تسلی بخش نہیں ہیں اور وہ فکر مند ہو جاتا۔ ایک روز جب راجہ اپنے درباریوں کے ساتھ کسی اہم تقریب پر جا رہا تھا۔ تو دفعتاً وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ وزیر سے کہنے لگا۔ دیکھو ہمیں کسی نے یاد نہ دلایا ہم سر پر پگڑی رکھے بغیر ہی آ گئے۔ پگڑی کے بغیر تقریب میں شمولیت کرنا کتنا معیوب ہو گا۔ یہ سن کر وزیر نے خدمت گزار کو حکم دیا بولا محل میں جاؤ اور مہاراج کی پگڑی لے آؤ۔ جب تک ہم یہیں انتظار کریں گے۔

اتفاقاً کسی درباری کی نگاہ راجہ کے سر پر پڑی دیکھا کہ پگڑی راجہ کے سر پر ہے۔ درباری نے عرض کی حضور پگڑی تو سرِ مبارک پر موجود ہے۔ راجہ نے ہاتھ اٹھا کر

پگڑی کو ٹٹولا۔ پا کر اطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگا بہت اچھا کیا تم نے ہمیں بتا دیا ورنہ ہم یہاں ننگے سر ہی کھڑے رہتے۔

عزیز ملک کا المیہ یہ ہے کہ وہ ننگے سر اس غم میں چور کھڑا ہے کہ کاش اس کے سر پر پگڑی ہوتی اور اس کے ملاقاتیوں اور دوستوں میں یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ "ملک پگڑی تو تیرے سر پر ہے"۔

بدقسمتی سے عزیز ملک سے پہلی ملاقات ہی میں میں نے اس کے سر کی پگڑی دیکھ لی۔ اس پگڑی میں اسلامی علم و عمل کے چند ایک ایسے حاشیے بھی تھے کہ میرے دل میں عزیز ملک کے لئے احترام پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس سے آپ آپ میں پھنس کر رہ گیا۔ اور تو تڑاق تک نہ پہنچ سکا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ میں اس کا دوست بن جاتا اور حسبِ عادت موقعہ بے موقعہ اسے ابے او کر کے کہتا۔ ہوش کر ننگے سر کیوں کھڑا ہے۔ اندھے پگڑی تو سر پہ ہے اور شاید بات اس تک پہنچ جاتی۔

پتہ نہیں کیوں اگر احترام کے ساتھ مہذب انداز میں کہیں کہ حضور پگڑی تو آپ کے سر پر ہے تو سننے والے کو یقین نہیں آتا یا کہنے والے کی بات میں اثر پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال بات پہنچ نہیں پاتی۔ تو تڑاق بے ادبی سہی لیکن تیر نشانے پر بیٹھتا ہے اثر کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

جب میں عزیز ملک سے متعارف ہوا۔ ان دنوں میں آزاد تھا۔ آوارہ تھا۔ مستول تو تھا۔ بادبان نہ تھے۔ جب بادبان ہی نہ ہوں تو ہوا چلے نہ چلے کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ مجھے راستے کا احساس تھا نہ شعور تھا نہ تلاش تھی۔ اس کے برعکس عزیز ملک آوارگی سے ناواقف تھا۔ اگرچہ وہ ازلی راہ رو تھا۔ راستے کی کئی ایک پگڈنڈیوں کو ناپ چکا تھا۔ وہ راستے کی دھول سے اٹا ہوا تھا۔

وہ مجھے اس دشت نما راستے پر لے گیا۔ ہم دونوں کا جوڑا بھی عجیب تھا لے جانے والا میلہ دیکھ کر لوٹا تھا جانے والا میلہ دیکھنے جا رہا تھا۔ نہ جانے میلے کا نیا پن تھا یا کیا۔ مجھے یوں لگا

جیسے بادبان لگ گئے۔ ہوا چلنے لگی۔ راستے کا مفہوم پہلی مرتبہ آنکھوں کے سامنے آیا۔ ڈگر کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے کسی شعبدہ باز نے ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ آنکھوں میں سرسوں پھول گئی۔ لیکن یہ قصہ تو "علی پور کے ایلی" کی دوسری جلد کا موضوع تھا۔

بہرحال عزیز ملک کے توسط سے میں اس نئی ڈگر تک پہنچا۔ عزیز ملک میرے لئے سنگِ میل بن گیا۔ گویا تو تڑاخ کا تعلق پیدا کرنے کے امکانات بالکل ہی ٹوٹ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عزیز ملک ننگے سر ہی کھڑا رہا۔

حفیظ جالندھری عزیز ملک کے پرانے دوست ہیں ایک روز جب حفیظ جالندھری کی موجودگی میں میں نے ملک کو یاد دلایا کہ ملک پگڑی تو تیرے سر پر ہے تو حفیظ مجھے کھینچ کر اکیلے میں لے گیا۔ کہنے لگا۔ مفتی ممتاز اسے پگڑی کا یقین نہ دلا۔ اگر اسے یقین آ گیا تو اس کے سر پر اتنا بوجھ پڑ جائے گا کہ یہ اسے سہار نہ سکے گا۔ شاید وہ رمز آشنا سچ کہتا ہو۔ لیکن شاید۔۔

حفیظ میں دو خصوصیات نمایاں ہیں۔ شعر سوچے بغیر کہتا ہے۔ اس لئے ابو الاثر ہے۔ بات سوچے بغیر نہیں کرتا اس لئے ابو الکلام ہے۔ سالہا سال سے جاننے کے باوجود حفیظ آج تک مجھے مفتی ممتاز کہہ کر بلاتا ہے۔ ممتاز مفتی کے وجود کو اس نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔

شاید عزیز ملک کے سر پر پگڑی کے بوجھ کی بات اس نے ایسے ہی سوچ سمجھ کر کہی ہو۔ جیسے میری آمد پر وہ سوچ سمجھ کر مفتی ممتاز کہا کرتا ہے۔

عزیز ملک کو یہ شکایت ہے کہ حالات نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس کی یہ شکایت بالکل درست ہے۔ واقعی حالات نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ حالات نے اس کے ساتھ صریحاً بے انصافی کی ہے۔

بچپن میں عزیز ملک کو لاڈ پیار نہ ملا۔ بے فکری کی کیفیت میسر نہ آئی۔ تنگی ترسی، سخت گیر باپ بے حیثیت ماں، خشک زہد سے بھرا ہوا گھر۔ انا میں ڈوبا ہوا گھر والا۔ کٹر کٹر اضبط۔ عزیز ملک اور چاروں طرف چھائی ہوئی کسمپرسی۔

ابھی نوجوانی میں قدم دھرا ہی تھا کہ ازدواج کی زنجیریں پہنا دی گئیں۔ شریکِ حیات میں سبھی کچھ تھا۔ صرف شریکِ حیات بن نہ سکیں۔

پھر اسی کلکتہ دفتر میں عزیز ملک کے ماتھے پر کلرکی کا کلنک لگا۔ جس کا نقشہ راول دیس میں اس نے فنکارانہ انداز میں کھینچا ہے۔ کلنک کا یہ ٹیکہ کسی کو دکھائی نہ دیا لیکن عزیز ملک اسے اٹھائے پھرتا رہا۔ آج بھی اٹھائے پھر رہا ہے۔

ہاں حالات نے عزیز ملک کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی کی لیکن عزیز ملک کے ساتھ اس سے بھی بڑی بے انصافی بلکہ ظلم خود عزیز ملک نے کیا۔ اب بھی کر رہا ہے۔ نہ جانے کب تک کرتا رہے گا۔ سر کی پگڑی جو دکھتی تھی نہ دیکھی۔ کلرکی کا کلنک جو نہ دکھتا تھا۔ دیکھتا رہا۔ تخیل اور کلام کا ادب جو واضح تھا نہ دیکھا۔ چھپنے کی خواہش کو جس کی حیثیت ضمنی تھی۔ حسرت بنا کر سینے سے لگائے رکھا۔

عزیز ملک کی کیفیت ایسے بچے کی سی ہے جسے پورا حصہ نہ ملا ہو اور جو ملا وہ اس نے احتجاجاً یہ کہہ کر لوٹا دیا ہو "پورا نہیں کرتے تو یہ بھی لے لو" شاید یہ بھی درست ہو کہ عزیز ملک کو پورا حصہ نہیں ملا لیکن عزیز ملک کو بھرپور حصہ ملا۔ ورثہ میں اسلام طب اور ادب جو آبا نے عطا کیا۔ مطالعہ جو ناخوشگوار بچپن نے دیا۔

عزیز ملک کو ذہن اور کردار کی صلاحیتیں عطا ہوئیں۔ علم و ادب کے ساتھ ساتھ عمل کی توفیق ملی۔ ایمان کے ساتھ وسعتِ نگاہ ملی۔ بڑے ادیبوں، شاعروں کا قرب حاصل ہوا۔ بزرگوں اور اولیا نے پاس بٹھایا۔ شریعت اور طریقت دونوں مزے چکھنے کو ملے۔ قلم میں تاثیر ملی۔ زباں میں اثر ملا۔ اتنا کچھ ملا لیکن وہ یہ نہ بھول سکا کہ کیا نہیں ملا۔ کلرکی کے ٹیکے کو نہ بھول سکا پگڑی سر پر ہونے کے باوجود ننگے سر ہی کھڑا رہا۔ بدقسمتی سے ایسے دوست ملے جنہوں نے اسے یہ یاد دلانا خلافِ مصلحت سمجھا کہ پگڑی تو اس کے سر پر ہے۔

لیکن شاید یہ احساسِ محرومی بھی قدرت کی ایک دین ہو۔ تاکہ ناسور رستا رہے۔ درد اٹھتا رہے۔ ٹیس جاری رہے۔ تار لرزاں رہیں۔ تاکہ نغمہ پیدا ہوتا رہے۔

یہ تعارف عزیز ملک کی شخصیت کا ہے۔ ان فن پاروں کا نہیں جو راول دیس میں درج ہیں۔ شخصیت کی یہ تجرباتی جھلکیاں بھی میرے ذاتی تاثرات ہیں۔ ممکن ہے یہ تاثرات کہیں حقیقت سے لگا کھاتے ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ بہر صورت ایک بات مسلم ہے کہ مجھے عزیز ملک کی شخصیت پر لکھنے کا حق حاصل ہے۔

ادب میں اصولی طور پر آپ کسی شخصیت پر تبصرہ نہیں کر سکتے۔ جب تک آپ کو اس شخصیت سے پیار بھری بے پناہ ہمدردیاں نہ ہوں۔ ہاں مجھے عزیز ملک پر لکھنے کا حق حاصل ہے۔ آخر میں عزیز ملک کے ان فن پاروں کے متعلق میں یہ کہہ کر بات ختم کر سکتا تھا کہ وہ آپ کے پیش پیش ہیں "مشک آنست کہ خود ببوید" اگرچہ میں عطار نہیں ہوں پھر بھی راول دیس کے اس تعارف میں مجھے عزیز ملک کی تصنیف پر کچھ نہ کچھ کہنا پڑے گا۔ ورنہ لوگ کہیں گے مفتی نے عزیز ملک کی شخصیت کی ڈگڈگی تو بجائی مگر رسمی تنقید کا سانپ نہ نکلا۔

آپ سے کیا پردہ ہے کہ میں رسمی تنقید اور رسمی تحریر دونوں سے بیگانہ ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ رسم دنیا موقعہ اور دستور کو نظر انداز بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ تو جنابِ من۔ راول دیس مضامین کا مجموعہ ہے

ان مضامین میں انشائے لطیف کی پھلکاری پر فکر کے بیل بوٹے بھی ہیں۔ اور تخیل کے ہیولے بھی، سنجیدگی بھی ہے اور ظرافت بھی۔ پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ لیکن طنز کے تیر و نشتر ان تحریروں کی جان ہیں۔

یہ پھول ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ وہ لڑی پنڈی کے بیتے ہوئے دنوں کا ثقافتی ماحول ہیں۔ عزیز ملک کو پنڈی اس کے نواحی علاقوں سے والہانہ محبت ہے۔ اور اس دیس کے مفلوک الحال لوگوں سے بے پناہ لگاؤ ہے۔

راول دیس کے عوام کی حکایات بیان کرتے ہوئے عزیز ملک کی آنکھوں میں سوڈے کی بوتلیں کھل جاتی ہیں۔ پھر وہ جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر اپنے منفرد طرز بیان کی رنگ پچکاری سے ہولی کھیلتا ہے اور محفل کو گلنار بنا دیتا ہے۔

دقیق مقالہ ہو یا انشائے لطیف، خاکہ ہو یا افسانہ ہر صنفِ ادب میں عزیز ملک کا اسلوب بیان منفرد ہوتا ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور بندش۔ جملوں کی تشکیل و ترتیب اسالیب بیان اور صفات و تراکیب ہر بات پر عزیز ملک کی انفرادیت کی مہر ثبت ہے۔ عزیز ملک زندگی میں جسقدر سادہ اور پھیچر ہے۔ ادب میں اتنا ہی شوقین مزاج اور شوخ ہے زندگی میں سر لٹکا کر راستہ ناپتا ہے۔ تحریر میں راہ چلتوں کی چٹکیاں بھرتا ہے۔ مسخریاں کرتا ہے۔ فقرے کستا ہے۔ ساتھ ساتھ قاری کو آنکھ مار کر کہتا ہے ذرا دیکھئے تو۔ ادب کی سرزمین پر وہ یوں بے تکلف گھومتا ہے جیسے کوئی الہڑ مٹنی مونڈھے مار مار کر جھولتی جھومتی میلہ گھوم رہی ہو۔

دنیائے حقیقت کی محرومیاں۔ دنیائے تخیل کی حصول یابیاں، حق باحقدار رسد۔

بے شک عزیز ملک خصوصی سٹائل کا مالک ہے ہر موضوع پر انداز بیان کی رنگینی جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ لیکن زاویہ نظر موضوع کے مطابق بدل جاتا ہے۔ چھاؤنی کی کہانی۔ سات ناٹ اور کلکتہ دفتر میں وہ طنز کے پٹاخے چلاتا ہے۔ مگر روحانی فضا میں ادب و احترام کا لبادہ پہن آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ ادبی ماحول میں طنز پر مزاح کی لطافت غالب آتی ہے اور تحقیق کی چاندنی بچھ جاتی ہے۔ بے شک عزیز ملک کی تحریر میں رنگینی بھی ہے اور روانی بھی۔ لیکن ابھی تک کہیں کہیں بے اعتمادی جھجک دبا دبا غصہ اور جذباتی شدت کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ جو اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ابھی تک عزیز ملک گزشتہ ناکامیوں اور تلخیوں کو بھلا نہیں سکا۔ ابھی تک اس نے زمانے کی ناانصافیوں کو معاف نہیں کیا۔ ابھی تک وہ اپنے شانوں پر خیالی محرومیوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ ابھی تک وہ ننگے سر کھڑا ہے۔ جس روز عزیز ملک نے اس خیالی محرومی کے جوئے کو سر سے اتار پھینکا ان موہوم بیڑیوں سے آزادی حاصل کرلی۔ اس روز اس کی تصنیفات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے گا۔

محمد طفیل ۱۹۶۷ء

آپ جناب صاحب کے آئینہ میں

طفیل کی شخصیت کے متعلق کرشن چندر لکھتے ہیں :-

”پہلی بار جب طفیل میرے کمرے میں داخل ہوئے تو پہلی نظر میں وہ مجھے سجادہ نشین نظر آئے۔ دوسری نظر میں لکڑیوں کے ٹال کے مالک، تیسری نظر میں ایک معصوم سے بچے، چوتھی نظر کا انہوں نے موقعہ ہی نہیں دیا۔۔۔ اس وقت تک وہ مجھ سے بغلگیر ہو چکے تھے“۔

طفیل سے بیسوں مرتبہ مل چکا ہوں۔ بغلگیر ہوئے بغیر بھی انہوں نے کبھی مجھے دوسری نظر کا موقعہ نہیں دیا۔ اندازہ ہے کہ دوسری نظر کا موقعہ انہوں نے کبھی کسی کو نہیں دیا۔ اس لحاظ سے طفیل ایک چاند ہے۔ دوسری سمت کے بارے میں آپ صرف اندازے لگا سکتے ہیں۔

طفیل سے ملئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے سامنے رواداری اور معصومیت کا پیش منظر ہے۔ لیکن کبھی کبھار اس چھائے ہوئے پیش منظر پر ہونٹوں کے کسی ان جانے کونے سے شرارت بھری سلوٹ ابھرتی ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ قریب بہت قریب کوئی آپ پر ہنس رہا ہے۔ آپ کا مذاق اڑا رہا ہے آپ چونکتے ہیں لیکن طفیل کی معصومیت آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔

اپنے محلے والوں کے متعلق شکیلا سے وضاحت کرتے ہوئے طفیل نے کہا تھا” یہ

سب لوگ مجھے صورتہ جانتے ہیں۔ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ اس لحاظ سے میں بھی طفیل کا محلے دار ہوں غالباً ہم سب ان کے محلے دار ہیں۔ بیسیوں ملاقاتوں کے باوجود میں انہیں صرف صورتاً جانتا رہا۔ وہی ایک نظر، دوسری نظر کا موقع مجھے طفیل نے نہیں بلکہ "آپ"، "جناب"، "صاحب" اور "محترم" نے دیا۔ میں نے پہلی مرتبہ طفیل کو ان تحریروں کے آئینے میں دیکھا۔ غالباً طفیل وہ پدمنی ہے جسے آئینے کی مدد کے بغیر دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔

طفیل ان شخصیتوں میں سے نہیں جو صورتاً ہویدا ہوتی ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے بھی نہیں جو بات چیت اور برتاؤ میں اپنا آپ اجاگر کرتی ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے بھی نہیں جو آپ سے تو کیا اپنے آپ سے بھی دل کی بات کہہ سکتی ہیں۔

طفیل کو صورتاً جاننے اور "آپ" میں ان کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے کہ طفیل گونگا پہلوان ہے اور اگر پہلوان کی قوت کی نوعیت اور اس کے تصرف کے انداز کو مد نظر رکھ کر بات کی جائے تو یوں کہنا پڑے گا کہ طفیل گونگی پہلوان ہے۔

یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس لئے پہلوان ہیں کہ گونگے ہیں یا اس لئے گونگے ہیں کہ پہلوان ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اگر طفیل کی شخصیت پہلوان اور گونگے دونوں ستونوں پر استوار ہوتی تو بات گڈمڈ نہ ہوتی۔ فطرت نے گونگے پہلوان میں نسائیت کی ایک رنگین لہر دوڑا کر بات اُلجھادی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شخصیت میں جاذبیت اور اسرار کی کلی لگ گئی۔ عزم میں ضد پیدا ہوگئی۔ نقوش کے ماتھے پر بندی لگی اور آنکھ میں سرمے کی دھار!۔۔۔

وہ پبلشر سے ادیب بن گئے۔ تحریر میں آگ نے پھول انگاروں کی شکل اختیار کر لی اور طفیل بذات خود ایک المیہ بن کر رہ گئے۔

اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے کہ ازلی طور پر اظہار کے راستے مسدود ہوں۔ ایک طوفان چلنے کیلئے بے تاب ہو لیکن احتیاط، سلیقہ، نیکی اور حسن سلوک کے خبط دامن تھام کے بیٹھے ہوں۔

طفیل کے "آئینوں" پر تبصرہ کرتے ہوئے کرشن چندر نے لکھا تھا:۔

"لکڑیوں کے اس گٹھے میں جس کا نام "جناب" ہے ہر طرح کی لکڑی ہے۔ موٹی اور تپلی بھی، نئی اور پرانی بھی، گیلی اور سوکھی بھی، مگر ادیبوں کا یہ پشتارہ ہے بے حد دلچسپ، صفحہ اول سے آخر تک یہ کاغذی زنبیل گوناں گوں جادو رنگ کیفیتوں سے معمور ہے اور ان میں ہر لکڑی جلتی ہے۔ کوئی پطرس کی طرح پٹاخے چلاتی ہے کوئی مرزا ادیب کی طرح رک رک کر جلتی ہے۔ کوئی شکیلا اختر کی طرح ایک ہی رنگ میں جلتی چلی جاتی ہے تو کوئی مجاز کی طرح جل کر راکھ ہو چکی ہے۔

کرشن چندر نے اس لکڑی کا تذکرہ نہیں کیا جو پھلجڑی کی طرح جلتی ہے۔ جگہ جگہ ایسے پھول انگارے چھوڑتی ہے کہ ساری فضا ان پھول انگاروں سے بھر جاتی ہے۔ اور جملہ لکڑیاں پس منظر میں سلگتی رہ جاتی ہیں۔ ایسے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے "آپ"، "جناب"، "صاحب" اور محترم کے پردے میں، میں ہی میں جلوہ آرا ہو۔ اس ذوق جلوہ آرائی نے طفیل کو ادیب بنادیا۔

ویسے طفیل سے پوچھیئے تو وہ جلوہ آرائی کے حق میں نہیں۔ چونکہ اس سے زیادہ شان ٹپکتی ہے۔ شکیلہ نے پوچھا "آپ نے مکان پر اپنے نام کی تختی لگائی ہوتی"۔ طفیل نے جواب دیا، میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے۔

صاحب کے دیباچے میں طفیل خاکے کے متعلق فرماتے ہیں:

خاکے میں ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گھسا ہوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں دکھائی دے۔ اگر مصنف خود کو لانے پر مجبور ہو تو ایسے جیسے قمیض میں بٹن نہ کہ بٹن میں قمیض۔ لیکن ان آپ جناب، صاحب اور محترم برانڈ کی قمیضوں کو ملاحظہ کیجئے۔ ان پر جابجا بٹن ٹانکے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جگہ جگہ بٹن جھانکتے ہیں، لیکن وہ کتنے اچھے لگتے ہیں۔

شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے طفیل چپکے سے چق اٹھاتے ہیں اور جھانک کر زیر لب کہتے ہیں "میں خاکسار ہوں نہ"۔ "میں تو کودن ہی رہا" "شرفا میں سے نہیں ہوں" "معقول نہ بن

سکا"۔ "تعصبات میں کھویا ہوا ہوں"۔ "میری خام خیالی یہ ہے"۔

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ طفیل کی اپنی ذات کے متعلق خام خیالیوں، ناچیز راؤں، من آنمیوں سے بچئے۔ ان بھول بھلیوں میں پھنس کر آپ کچھ پا نہیں سکتے۔ صرف کھو سکتے ہیں۔ طفیل کو "راستہ تلاش کرو" قسم کا گورکھ دھندا بُننے کا شوق ہے اور قاری کو جستجو پر آمادہ کرنے کیلئے انہوں نے "میں تو کچھ بھی نہیں"، "میرا کیا ہے"، "میری بات چھوڑیئے" قسم کے انوکھے سنگار ایجاد کر رکھے ہیں۔ دراصل یہ من آنمیاں انہوں نے آپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کیلئے وضع کر رکھی ہیں۔ یہ روکو مت جانے دو کے سے جملے دہرایا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے میری طرف دیکھنے میں تو کچھ بھی نہیں دیکھیے نا۔ میرا مطلب ہے دیکھنے میں منت کرتا ہوں میری بات چھوڑیئے۔

بے شک طفیل کا خلوص مسلم ہے شرط یہ ہے کہ بات ان کی ذات کے متعلق نہ ہو۔ آپ یا مجھ سے ہی نہیں بلکہ اپنے آپ سے چھپتے رہنے کیلئے انہوں نے بجز بازیوں کا ایک عظیم الجھاؤ تخلیق کر رکھا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھار خلوص کی کرن اپنی ذات پر پڑ جاتی ہے۔ وہ چونک پڑتے ہیں۔ پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور پھر موضوع بدل دیتے ہیں۔ اس کے سوا چارہ کار بھی ہو۔

وہ رنگین مخلص اور جہاندیدہ بڈھا بھی جسے ہم بابائے اردو کہتے ہیں طفیل کی شخصیت کے متعلق "عجیب و غریب" کہنے سے باز نہ رہ سکا۔ اگر اسے رکھ رکھاؤ کا خبط نہ ہوتا تو یقیناً عجیب و غریب کی وضاحت کرتا۔

طفیل کی منہ بولی بہن شکیلہ اختر تہذیب، احتیاط اور احترام کے باوجود اپنے بھائی صاحب کو "چپ شاہ" اور "چالتہ" کے القاب دیئے۔ چپ + شاہ + چالتہ میں طفیل کی شخصیت کے تینوں پایہ ستون موجود ہیں۔ لوگوں کی آرا کو چھوڑیئے خود طفیل کی کہی ہوئی باتیں سنیئے "جناب" میں طفیل اپنی شخصیت پر مضمون لکھتے ہیں۔ جو شخص جگہ جگہ میری بات چھوڑیئے کی رٹ لگاتا ہوا آیا ہو وہ بھلا اپنی شخصیت پر کیسے لکھے۔ لیکن جو شخص میری طرف دیکھنے کی

دعوت دیتا آیا ہو وہ بھلا اپنی شخصیت پر کیوں نہ لکھے۔ اس کش مکش سے نکلنے کا کیا احسن طریقہ اختیار کیا گیا۔ جو صرف طفیل کو سوجھ سکتا تھا۔ طفیل نے خاکے کا عنوان مدیر نقوش رکھ دیا۔ دونوں باتیں پوری ہو گئیں۔ میری طرف دیکھئے بھی میری بات چھوڑیئے بھی۔

اس خاکے میں طفیل التزاماً اپنی شخصیت کے ضمنی پہلوؤں کی رنگین جاذب نظر من آنمیوں کی پھلجھڑیاں چلانے میں شدت سے محو ہیں۔ اس لئے کہ کہیں بنیادی بات نہ چھڑ جائے لیکن اس کو کیا کیجے کہ بات نکل ہی جاتی ہے۔

صفحہ ۹۴ پر اپنے بارے میں لکھتے ہیں،

"میں ان صاحب کو ۱۴ اگست ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں مگر یہ حضرت مسلسل چکر دیئے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا"۔

انہیں صفحات میں انہوں نے اپنے متعلق اپنے دوستوں کا خیال درج کیا ہے۔

"طفیل برانڈ قسم کے لوگ بہت ہی کمیاب ہیں بلکہ یہ برانڈ اب آتا ہی نہیں"۔

پھر یہ بھی۔۔۔ "جب بھی اپنے بارے میں غور کیا تو طفیل میں، دوسرا طفیل چھپا ہوا پایا"۔

لیکن "راستہ تلاش کرو" کے ازلی شوق نے حقیقت کا پلو چھڑا لیا، جھٹ یہ بات بنائی، نقاب گرایا بولے "یہ دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے" یوں کرسی ادارت پر بیٹھنے کا ناٹک کھیل کر صاف بچ کر نکل گئے۔

بہر حال یہ حقیقت مسلم ہے کہ طفیل میں ایک اور طفیل چھپا بیٹھا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک پہلوان ہے، مگدر اٹھائے پھرتا ہے، ہمچو من دیگرے نیست، دوسرا دھان پان، گھونگھٹ نکالے، ہاتھ جوڑے من آنم کہ من دانم۔ طفیل اپنے ان دونوں پاٹوں تلے پس رہے ہیں اور آپ اور میں راستہ تلاش کرو کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

شخصیت پر نجوم کے اثرات کے مطابق یہ ساری قیامت طفیل کی تاریخ پیدائش کی وجہ سے ہوئی۔ اگر وہ سات آٹھ دن پہلے پیدا ہوتے تو لیو (Leo) ہوتے جس کا نشان شیر ہے۔

خالص پہلوان، اپنے جیسا کسی اور کو نہ سمجھتے۔ ٹھہرو میری بات سنو، میری طرف دیکھو، میں نے تمہیں کہا نہ تھا۔ سا انداز ہوتا، چھاتی نکلی رہتی، مونچھ مروڑ کر چلتے۔

اگر وہ سات آٹھ دنوں کے بعد پیدا ہوتے تو خالص ورگو (Virgo) ہوتے جس کا نشان دوشیزہ ہے۔ جسے "کنیا" بھی کہتے ہیں۔ پاکیزہ دوشیزہ، آرسی کا کٹورہ سا کر انتظار کرنے والی۔ لاج کی ماری، پلے سے دیا بجھانے والی بے زبان، سر تسلیم خم کرنے والی داسی۔

لیکن طفیل اس وقت پیدا ہوئے جب لیو کا شیر مدھم پڑتا جا رہا تھا اور دوشیزہ ابھر رہی تھی۔ شیر اور دوشیزہ کا ملاپ ہو گیا۔ یوں شیر اور دوشیزہ خلط ملط ہو گئے۔ شیر میں دوشیزہ کا یا دوشیزہ میں شیر کا پیوند لگ گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ طفیل میں شیر کی دبی دبی تندی ہے، غصہ ہے، خود اعتمادی ہے۔ آگے بڑھنے کا جنون ہے۔ نقوش خولیہ ہے، ایسا کام ہاتھ میں لینے اور اسے تکمیل دینے کا جذبہ ہے جو کوئی دوسرا نہ کر سکتا ہو۔ دوسرے کو کھری کھری سنا دینے کی جرات ہے اور اس کے ساتھ ہی دوشیزہ ایسی جھجک ہے۔ رنگین بیانی ہے، حسن پسندی ہے، لاج کا احساس ہے، عجز ہے، قوت برداشت ہے اور نیکی کا بے پناہ خبط ہے۔

آپ صاحب، جناب اور محترم میں جگہ جگہ دوشیزہ گنگناتی ہے۔ کہیں کہیں شیر دھاڑتا ہے۔ دوشیزہ اور شیر۔ کس قدر رومان بھرا امتزاج ہے۔ رنگین دو آتشہ، دوشیزہ کہتی ہے،

"اچھائیوں کا اظہار برملا کرتا ہوں، کمزوریوں کے اظہار کیلئے جواز ڈھونڈتا ہوں۔ پھر اشارۃً کچھ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتا ہوں۔ اتنی احتیاط پر بھی دوست خوش نہ ہوئے۔ (آپ ۱۳۵)

شیر کہتا ہے:

"چونکہ ہمیں کچھ اور کچھ اور کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اس لئے میں بھی بال کی کھال اُتاروں گا۔ خواہ سلیقہ ہو یا نہ ہو" (آپ ۱۸۱)

دوشیزہ کہتی ہے:

"میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی ماروں، میرا موضوع شخصیتوں کا

ہے"۔ (آپ ۱۸۸)

شیر کہتا ہے:

"میں بھی ایسا کھرا انسان ہوں کہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ خواہ زبان سے کچھ کہوں۔ دماغ یہی کہتا ہے، ہنھ!" (آپ ۱۸۸)

دوشیزہ کہتی ہے:

"میں کوئی مفتیِ وقت ہوں کہ کسی کو مسلمان ہونے کے اور کسی کو مسلمان نہ ہونے کے پرمٹ بانٹتا پھروں" (آپ ۳۱)

شیر دھاڑتا ہے:

"آج مولویوں کا دوکاندار طبقہ ادب کو جس طرح مسلمان بنانے کی فکر میں ہے اس میں ادیب کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا"۔ (آپ ۹۴)

شیر اور دوشیزہ الگ الگ بولتے رہیں تو محفل لگی رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار وہ ایک دوسرے کے مدمقابل آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں۔ پھر بھانڈے پھوٹتے ہیں۔ پردے چاک ہوتے ہیں۔ بھرم ٹوٹ جاتے ہیں۔

دوشیزہ کہتی ہے:

"انہیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی غلط فہمی نے انہیں مدیر نقوش بنایا ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت ہنھ"! (جناب ۱۱۱)

شیر دھاڑتا ہے:

"اپنی قسمت میں خدا نے کسی معاملے میں ہار نہیں لکھی"۔ (آپ ۷۶)

دوشیزہ مذاق اڑاتی ہے:

"آج بھی جب کہ اس واقعہ کو تیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے انہوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت کو ترک نہیں کیا"۔ (جناب ۹۶)

ان گھر کے بھیدیوں کی باہمی چپقلش کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لنکا ڈھے جاتی ہے اور لنکا کی اوٹ میں چھپے ہوئے مناظر منظرِ عام پر آجاتے ہیں۔ لیکن جب یہ دونوں سمجھوتہ کر کے ایک ہو جاتے ہیں تو اندھیرے اجالے سمٹ کر معدوم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ روپہلی شفق چھا جاتی ہے۔ ایک حسین دھندلکا ابھرتا ہے۔ بادِ نسیم چلتی ہے۔ کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ اور ادب کی دنیا میں بہار آجاتی ہے۔ لیکن اس ملاپ کے باوجود شیر شیر رہتا ہے اور دوشیزہ دوشیزہ!

شیر لکھواتا ہے، دوشیزہ لکھتی ہے :

شاہد احمد کو خط لکھاتے ہوئے شیر گرجا، لکھو دوشیزہ، "شاہد احمد خطرناک آدمی ہیں"۔ دوشیزہ گھبرا گئی۔ اس نے بڑھ کر شیر کی گرج پر پھولوں کی چادر ڈال دی۔ بولی "شاہد احمد دہلوی تو اچھے آدمی ہیں مگر جو ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں اصل میں وہ ہیں خطرناک"!

شیر جھنجھلایا، "لکھو دوشیزہ، شاہد احمد صاحب جو مضمون آپ نے لکھا ہے وہ مجھے پسند نہیں"۔ دوشیزہ لکھ کر مسکرائی اور اپنی طرف سے کلی ٹانک دی۔ اس میں میرا شاہد احمد نہیں"۔ (آپ ۱۶۵)

نیاز کے متعلق شیر نے لکھا "آپ شعروں کا آپریشن بھی خوب کرتے ہیں۔ اس آپریشن میں شعر کو ذبح بھی کر ڈالتے ہیں۔ اصلاحیں بھونڈی دیتے ہیں"۔ دوشیزہ نے چپکے سے "میری رائے میں" بڑھا دیا (جناب)

شیر نے لکھا "آپ ابتدائی دور میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ چونکہ عمر کے ساتھ ساتھ استادی شان بھی بڑھتی ہے۔ دوشیزہ نے دھار کُند کرنے کیلئے بڑھایا اس لئے سوچنے کا مقام ہے۔ قصوران کا ہو لیا یہ بھی ان کی عمر کے پلے باندھنا پڑے گا"۔ (جناب ۴۳)

جوش کے متعلق لکھتے ہوئے شیر غرایا "وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے قابو میں رکھتے ہوں گے کہ ہمیں دنیاوی آنکھیں دیکھ رہی ہیں"۔ دوشیزہ نے اپچ دکھائی۔ "جوش صاحب کو ملمع بازی پسند نہیں [illegible] مصلحت آمیز قسم [illegible] قطع [illegible]

پرنا آشنا ہیں"۔ (آپ ۶۱)

ادب اور خاکہ نویسی میں طفیل کی عظمت کا راز یہ ہے کہ شیر زنجیر سے بندھا ہے اور دوشیزہ آزاد ہے۔ نجی زندگی میں طفیل کے المیے کا یہ راز ہے کہ شیر زنجیر سے بندھا ہے اور دوشیزہ (دوشیزگی کی ازلی بندشوں کے سوا) آزاد ہے۔ نقوش کے ضخیم نمبروں کی کامیابی اس لئے ہوئی کہ اگرچہ بندھا ہوا ہے مگر ہے وہ سچ مچ کا شیر۔ نقوش کا حسن اور نوک پلک دوشیزہ نے اپنے ذمہ لے لی۔ جملہ ادیبوں سے خوشگوار تعلقات اس لئے قائم ہوئے کہ شیر بندھا ہے اور دوشیزہ آزاد ہے۔

دوشیزہ نے کھل کھیل کر طفیل کو ادیب بنا دیا۔ اگر شیر کھلا ہوتا تو وہ بہت بڑے اور کامیاب بزنس مین ہوتے اور آج لاکھوں میں کھیلتے۔

دوشیزہ کے کھل کھیلنے کی بات سن کر شاید طفیل شرما جائیں۔ آپس کی بات ہے برادری سے کیا پردہ۔ کیا کیا جائے جب تک نسائیت کی کلی نہ ٹانکی جائے ادیب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ صرف طفیل ہی نہیں بیشتر ادیب ورگو (Virgo) دوشیزہ ہیں۔ مثلاً اشفاق احمد ہیں اور اگر مجھے بھی ادیبوں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے تو میں خود ورگو ہوں اور دوشیزہ کے چھنوں سے خاصا واقف ہوں۔ میری دوشیزگی کہہ رہی ہے یہ بھی لکھ دو کہ افسوس مجھ میں شیر کی آمیزش نہ ہوئی۔

"آپ میں، صفحہ ۱۶۲۔ ۱۵۵ میں طفیل نے خاکہ نگاری اور خاکہ نگاروں کے متعلق اپنے خیالات کا وضاحت سے اظہار کیا ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ پھول بھی ہوں اور کانٹے بھی، چٹکیاں بھی ہوں اور التفات بھی۔ یادحق بھی ہو اور رندانہ انداز بھی، لیکن طفیل کے جملہ خاکوں کو پڑھنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ طفیل کا ایمان ہے کہ آپ کسی شخصیت کو قلمبند نہیں کر سکتے۔ جب تک آپ کو اس شخصیت سے بے پناہ پیار نہ ہو۔ طفیل کو ان شخصیتوں سے بے حد پیار ہے۔ اتنا پیار ہے کہ پڑھنے والے کو غصہ آنے لگتا ہے۔ کبھی وہ ان کی وکالت کرتا

[illegible]

بال بناتے ہیں، سرمہ لگاتے ہیں، جیسے کسی ایسی عورت کے ہاتھ بچہ لگ گیا ہو جو اولاد سے محروم ہو اور خاکے سے ماں کی بُو آنے لگتی ہے۔ لیکن محبت کے ساتھ ساتھ وہ چٹکیاں بھی بھرتے جاتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے طفیل کہہ رہے ہوں، چٹکی بھرنے کا مزا ہی کیا جب تک دل میں محبت نہ ہو اور محبت کا مزا ہی کیا جب تک ساتھ چٹکیاں نہ ہوں اور سچ پوچھیے تو ان تمام خاکوں کی دلکشی اور حسن کا راز یہی چٹکیوں اور محبت کی آمیزش ہے۔

طفیل کے طرز تحریر کی تمام تر رنگینی، شگفتگی اور حسن بھی اسی آمیزش کی وجہ سے ہے۔ شخصیت میں شیر اور دوشیزہ کی آمیزش بیان میں چٹکیوں اور محبت کی آمیزش۔ اسلوب میں مٹھاس اور نمک کی آمیزش، عقیدے میں بُت پرست اور مومن کی آمیزش، کردار میں رادھا اور راہو کی آمیزش، مجھے اس گنگا جمنی رنگ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ایک جانب عمر خیام بیٹھے ہوں۔ دوسری جانب چغتائی کی حسینہ اور درمیان میں صراحی اور شیشے کی جگہ جائے نماز اور تسبیح پڑی ہو۔

افسانہ نویس!

اسے دیکھ کر میں چونکا، نہ تو اس کے چہرے سے کسی افسانے کا اظہار ہوتا تھا۔ اور نہ ہی پیشانی پر افسانہ نویسی کی جھلک تھی۔ البتہ اس کی محروم آنکھوں۔ ڈھلکے ہوئے گالوں اور بے حس خدوخال کی اوٹ میں افسانے بننے کی ایک دم توڑتی ہوئی خواہش سمٹی ہوئی تھی۔ افسانہ نویس؟ میں نے زیرِ لب دہرایا۔ آپ کا اسم گرامی۔

عمر۔

عمر۔ میرا جی چاہا کہ قہقہہ مار کر ہنس دوں۔ مگر عمر کی بڑی بڑی پھیکی آنکھوں میں محرومی اور بے بسی کی نمی دیکھ کر وہ قہقہہ گھٹ کر رہ گیا۔

اس وقت ہم مری کے ایک ویران ٹیلے پر کھڑے تھے۔ چاروں طرف بھیگا بھیگا اداس سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ اور دور "حوزی" کا سفید دھواں روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہا تھا۔ وہ دیکھو وہ۔ اشفاق چلایا۔ وہ پھر دریاں جھاڑنے لگے توبہ کس قدر گرد ہوتی ہے یہاں کی دریوں میں۔ بہت شادیاں ہوتی ہیں یہاں کے گاؤں میں [illegible] دریاں جھاڑتے رہتے ہیں۔

عمر نے غور سے اشفاق کی طرف دیکھا اور مسکرا مسکرا کر کہنے لگا۔ نہیں صاحب یہ گرد نہیں بادل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کبھی پہاڑ پر نہیں آئے۔ "اچھا جی" اشفاق نے الو کے پٹھے کی سی شکل بنا کر کہا۔ "ویسے دوبار سانگلہ ہل جانے کا اتفاق ہوا ہے مجھے" وہ گردن کھجانے

اسے ہمارے وجود تک کا احساس نہ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ٹائی کا سرا تھام رکھا تھا۔ آنکھوں میں ایک غیر مرئی چمک لہرا رہی تھی۔ ہونٹوں کے خم میں محرومیت کے باوجود اس کے گال جو کسی انجانے شوق سے تمتمانے لگے تھے اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے وہ افسانہ نویس نہیں بلکہ ایک "شرپا" ہو جو کسی برفیلی چوٹی پر اپنا جھنڈا گاڑنے کے خواب دیکھ رہا ہو۔ میں نے اشفاق کی طرف پر معنی نگاہ سے دیکھا اور اشفاق نے حسبِ عادت ایک مختصر سے اشارے سے عمر کی شخصیت پر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ اشفاق نے انگلی سے اپنا گال یوں پونچھا جیسے آنسو خشک کر رہا ہو۔

عمر سے وہ میری پہلی ملاقات تھی۔ لیکن آج چار سال بعد بھی اس کے متعلق میری رائے نہیں بدلی۔ وہ آنکھ سے گرا ہوا آنسو ہے جس کی تمام تر خواہش یہ ہے کہ کوئی حسین مخروطی انگلی ایک ہمدردانہ مگر جمیل انداز سے اسے پونچھ دے۔

ممکن ہے آپ نے بھی کبھی عمر کو پشاور روڈ پر سائیکل چلاتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس کے چہرے پر بے حسی کی ایک موٹی تہ چڑھی ہوتی ہے۔ گال کلون پر ڈھلکے ہوتے ہیں۔ آنکھیں مغموم اکتاہٹ سے بھری ہوتی ہیں۔ پیشانی پر شکن ہوتی ہے اور سر کندھوں پر یوں رکھا ہوتا ہے جیسے کیلوں سے ٹھونک دیا ہو۔ لیکن نہیں۔ راولپنڈی میں آپ عمر کو نہیں دیکھ سکتے۔ اسے دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اسے شہر سے دور لے جائیں۔ دور مری کے ٹیلوں پر۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کے قریب جہاں وہ روز دریاں جھاڑتے ہیں اور گرد اڑتی ہے۔ جہاں شام کو آسمان کو آگ لگ جاتی ہے اور صبح سویرے فضا میں دودھ کے دھارے ابلتے ہیں اور برف سے ڈھکے ہوئے ٹیلوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے دھرتی کی دیوی نے عنفوانِ شباب میں قدم رکھ دیا ہو۔

عمر کو ان پھلولدار دریوں سے محبت ہے جو پہاڑوں کے ڈھلانوں پر بچھی ہوتی ہیں اس گرد سے محبت ہے جو برسات میں ان پر اڑتی ہے، اسے اس سرزمین سے عشق ہے جہاں ہر موڑ ایک نیا منظر چھاتے ہوتا ہے۔ اسے ہموار زمین سے چڑ ہے۔ خالی پھیلاؤ اس کے لئے

جاذبِ نظر نہیں۔ وہ زیروبم کا متوالا ہے۔ اور ہمواریت کو موت کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کی انتہائی خواہش ہے کہ زندگی میں زیروبم کی حرکت قائم رہے۔ اسے سب سے بڑا ڈر یہ ہے کہ ہمواریت کے ہاتھوں اس کی زندگی فنا نہ ہو جائے۔

مری میں اس کی آمد کے چند روز بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ اس میں فطرت کی محبت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس روز برفباری ہو رہی تھی۔ مسعود اور میں کمرے میں بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ "عجب احمق ہو" وہ کمرے میں داخل ہو کر چلانے لگا۔ یہ وقت شطرنج کھیلنے کا ہے۔ ایسے خوبصورت منظر کو اپنے آپ پر حرام کر رہے ہو۔ یہ کیا حماقت ہے۔ عمر کے منہ سے اس وقت کف جاری تھا۔ پیشانی شکنوں سے بھری ہوئی تھی۔ گال تمتما رہے تھے۔ اور غصے میں یوں ہاتھ چلا رہا تھا۔ جیسے تلوار سے "ڈوئل" میں کھیل رہا ہو۔ اس کے باوجود مسعود جو اس کا پرانا دوست ہے یوں بیٹھا کھیل رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ کچھ دیر تک ہمیں برا بھلا کہنے کے بعد وہ غصے میں باہر نکل گیا اور پھر باہر برآمدے میں کھڑا ہو کر درختوں اور جھاڑیوں کو ڈانٹنے لگا۔ تھک کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا "کتنے بے وقوف ہیں یہ لوگ۔ اندھے۔" دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں منظر دکھانے کے لئے بے تاب نہیں بلکہ وہ خود محتاج ہے۔ اس بات کا محتاج ہے کہ خوشی میں کوئی اس کے ساتھ ہو۔ ساتھ کے بغیر اسے اپنی سالمیت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ خوشی کا جذبہ تکمیل نہیں پا سکتا۔ میں نے مسعود سے کہا چلو بھائی تمہارے بغیر اس کی زندگی حرام ہو رہی ہے۔ ہم دونوں نے برساتیاں اوڑھیں اور سوٹنے پکڑ کر باہر نکل گئے۔ ہمیں برف پر چلتا دیکھ کر پہلے تو وہ غصے میں چلانے لگا۔ خبردار جو برف پر قدم رکھا تو۔ خدا کی قسم میں مار دوں گا۔ پھر وہ منتیں کرنے لگا۔ خدا کے لئے آگے مت جاؤ۔ دیکھو نا ان حسین روئی کے گالوں پر پاؤں کا نشان لگ جائے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے سفید چادر میں لپٹی ہوئی پاکیزہ کنواری پر جارحانہ اقدام کیا ہو۔

عمر دھرم سال کا رہنے والا ہے جہاں سے جنوب کی طرف کانگڑے کے پہاڑی ڈھلان پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ کانگڑہ جہاں سیاہ فام عورتیں اپنے چھوٹے

جھونپڑوں کے دروازے پر کھڑی یوں ہر راہ چلتے کی طرف دیکھتی ہیں جیسے روزِ ازل سے اسی
کے انتظار میں کھڑی ہوں اور کام کاج میں مصروف ہونے کے باوجود اطمینان سے بیٹھے ہوئے
مرد کی طرف بار بار یوں دیکھتی ہیں جیسے اس کے وجود پر سرور و شادماں ہوں وہ کانگڑہ جہاں
ڈھلانوں پر عورت کی نس نس سے پیامِ حیات جھلکتا ہے۔ اور پھر شمالی چوٹیوں کی طرف
بتدریج بے حسی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ دھرم سالہ جس کے شمال میں سیاہ چٹانی چوٹیاں
بے نیازی اور تمکنت سے سر اٹھائے کھڑی ہیں، جنہیں دیکھ کر کوہ پیمائی کی خواہش انسان کو
بے تاب کر دیتی ہے۔

عمر کی شخصیت دھرم سالہ کے ان ڈھلانوں اور چٹانوں کی آمیزش سے بنی ہوئی
ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ دور کی سیاہ چوٹیوں کو جائے اور راستے میں ہر
جھونپڑے کے دروازے پر کھڑی ہوئی جوان عورت اس کی طرف دیکھ کر یوں مسکرائے
جیسے اور روزِ ازل سے اسی کا انتظار کر رہی ہو۔ اور وہ جھونپڑے میں داخل ہوئے بغیر اپنی راہ
ناپتا ہوا چلا جائے۔

اسے جھونپڑے میں داخل ہوتے ڈر لگتا ہے کیونکہ وہ ازلی طور پر ڈرپوک واقع ہوا
ہے۔ اسے ہر اس چیز سے پیار ہے جو عورت کے قرب کی امید لائے یا اس کا وعدہ کرے۔ مگر
عورت کے قرب سے وہ خائف ہے۔ لیکن اگر وہ قرب کی امید سے محروم کر دیا جائے تو وہ کھو
جاتا ہے اور اس کے پاؤں میں چلنے کی ہمت نہیں رہتی۔ وہ پانی سے خائف ہے مگر سراب کو
دیکھ کر دیوانہ وار پانی کی تلاش میں چلے جانے کا دیوانہ ہے۔ بچپن ہی سے یہ دورخی اس کے
جذبات پر حاوی رہی ہے۔ نوجوانی اس نے ڈگر ڈگر عورتوں کی متلاشی نگاہوں کی حدت سے ڈر
کر بھاگنے اور بے حس گدنوں کا تعاقب کرنے میں گزار دی۔ اور یوں کانگڑے کے مشتعل اور
سرگرم خطے میں بھی وہ اپنے آپ کو محروم اور متلاشی بنائے رکھنے میں کامیاب رہا۔ آج بھی عمر
وہی محروم و متلاشی عمر ہے اس کی تلاش محروم رہنے کا ایک ذریعہ ہے اس کی محرومیت
تلاش کا اک بہانہ ہے۔

عمر کے افسانوں میں بھی کانگڑہ اور کلو کی رنگیں جھلکیاں موجود ہوتی ہیں۔ اسے
منظر نگاری کا خبط ہے اور اس کی منظر نگاری میں منظر کی نسبت نگاری زیادہ ہوتی ہے اور پس
منظر باربار زبردستی پیش نظر میں یوں آگھستا ہے جیسے وہ ریڈیو کا راوی ہو اور پھر کرداروں کی
ذہنی کیفیت میں رنگ بھرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔

عمر کی کہانیوں میں سبزا کچھ زیادہ ہی سبز ہوتا ہے اور ڈھلانوں پر کچھ زیادہ ہی
پھولدار غالیچے بچھے ہوئے ہوتے ہیں جن سے گرد کچھ زیادہ ہی اڑتی ہے۔

خوبصورت جھونپڑیوں میں جلتے ہوئے شنگرفی کوئلوں کے قریب تپائیوں پر
چائے کے برتن زیادہ ہی کھنکتے ہیں اور جب رنگین اور شوخ دوشیزائیں کچھ زیادہ ہی بے باک
نگاہوں سے ہیرو کی طرف دیکھتی ہیں تو ان کے والدین آنکھیں جھکا لیتے ہیں جسے دیکھنے کے
لئے پگڈنڈیاں چپکے سے دبے پاؤں وادی سے اوپر چڑھ آتی ہیں اور اس رنگین کھیل کو دیکھ کر
شاخیں حال کھیلتی ہیں۔ پھول مسکرتے ہیں اور پنچھی گاتے ہیں۔

عمر کے افسانوں میں جذبات کا شیرا کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہوتا ہے حتیٰ کہ ہونٹ چپکنے
لگتے ہیں اس لئے اس کی پہلی کہانی پڑھ کر میں ہنس دیا تھا۔ انہی دنوں اگر اتفاق سے میری
ملاقات زری سے نہ ہوتی تو اب بھی میں اس کی کہانیوں پر ہنسا کرتا اور میرے دل میں ان
کہانیوں کے لئے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوتی جو انسان کو سوچنے پر مائل کر سکتیں اور جن میں ایک
واضح اور مضبوط مرکزی خیال نہیں ہوتا۔

زری خاندان ایک سبز ٹیلے کے پہلو میں ندی کے کنارے سرخ جھونپڑے میں
مقیم تھا۔ ایک روز بارک پور سے واپسی پر میں راستہ بھول کر اس جھونپڑے کی طرف جا نکلا۔
بڈھے زری نے دور سے مجھے دیکھا اور تپاک سے ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے، آخا۔ آیئے
آیئے، وہ میری طرف دیکھ کر یوں چلانے لگا جیسے میرا لنگوٹیہ ہو۔ "آیئے نا اس طرف۔"
"جی جی" میں نے اس سے راستہ پوچھنے کی کوشش کی۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے" وہ
قہقہہ مار کر ہنسا۔ مجھے معلوم ہے آپ راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔ کوئی بات نہیں میاں یہاں جو

کوئی بھی آتا ہے راستہ بھول کر آتا ہے۔ میں نے یہ جھونپڑا یہاں اسی لئے بنایا ہے کہ جو راستہ بھول کر آ نکلے وہ دو گھڑی یہاں سستا سکے۔ آؤ میاں چلے آؤ بس ایک کافی کا پیالہ اور پھر تم سیدھے چلے جانا۔ "بیگم بیگم" وہ چلانے لگا۔ ذرا باہر آؤ نا، کتیلی کو کلوں پر رکھ کر چلی آؤ مہمان آئے ہیں۔

بیگم زری ایک معزز عورت تھی جس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ منہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں مگر آنکھوں میں ایک عجیب سی تازگی اور چمک تھی۔ پانی ابھی ابل جائے گا تم کافی پیو گے بیٹا یا چائے؟ مجھے ہچکچاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں گویا رس کی بوندیں اڑنے لگیں تکلف کی کوئی بات نہیں اسے اپنا ہی گھر سمجھو بیٹا۔ اس گھر کے سبھی لوگ تمہاری طرح راستہ بھولے ہوئے ہیں۔

"ہی ہی ہی۔ بڈھے نے قہقہہ لگایا۔ "جب لوگ راستے پر چل رہے ہوتے ہیں تو ان میں فرعونیت کی جھلک ہوتی ہے اور جب راستہ بھول کر بھٹک جاتے ہیں تو ان میں انسانیت کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔ "ہی ہی ہی۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔ بیگم نے داخل ہو کر مسرت سے دمکتی ہوئی نظر زری پر ڈالی اور اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔

"وہ دیکھو وہ ندی کا دھارا" بڈھا چلانے لگا۔ "وہ بھی راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہے اور وہ سبز پوش وادی بھی" وہ ہنسنے لگا۔

"مینا" بیگم زری نے باآواز بلند پکارا۔ "بیٹی کافی ہو گئی کیا۔"

"لا رہی ہوں امی۔ قریب ہی سے بل کھاتی ہوئی بھٹکی ہوئی سی آواز آئی۔ پانی کے دھارے کا شور مدھم پڑ گیا۔

پھر دروازہ کھل گیا۔ مینا کتیلی اٹھائے ہوئے کھڑی تھی اور میں نے محسوس کیا جیسے صراط مستقیم بذات خود میرے رو برو ہو۔ وادی پر سکوت طاری ہو گیا۔ موت کا سا سکوت۔ پھر مجھے معلوم نہیں دور بڈھا زری ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بیگم زری نہ جانے کیا گنگنا رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں۔ ایک دھندلکا چھا گیا تھا جس میں مژگاں سے نیم ڈھکی صرف دو

شربتی آنکھیں روشن تھیں۔ جن میں سے رنگ کی بوندیاں اڑ رہی تھیں۔

اس روز واپسی پر پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ زمین پر سبزے کی جگہ پھولدار غالیچے بچھے ہیں اور ہوا چلتی نہیں بلکہ گدگداتی ہے اور پانی کے دھارے بہتے نہیں بلکہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

بائیں دفعتاً میں رک گیا میں نے محسوس کیا کہ میں عمر کی لکھی ہوئی کوئی کہانی بیت رہا ہوں۔ مجھے اس واقعہ کی حقیقت پر شک ہونے لگا۔ شاید وہ محض تخیل تھا یا عمر کی کہانی کا ایک تاثر۔ گھر پہنچ کر میں بھاگا بھاگا عمر کی طرف گیا۔ "بھئی اپنی کوئی کہانی تو دو۔" "کہانی؟" عمر نے یوں میری طرف دیکھا جیسے اسے کہانی سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ عمر اپنی کہانیوں کی نمائش کرنے کی بجائے ان کے تذکرے پر ندامت محسوس کرتا ہے جیسے اس کی کہانیاں اس کے راستہ بھولنے اور بھٹک جانے کا واضح ثبوت ہوں۔ "اپنی کوئی سی کہانی دے دو۔" میں نے کہا۔ "مجھے پڑھنا ہے۔" اس نے یوں مشکوک نگاہ سے میری طرف دیکھا جیسے کہانی کو پڑھنے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ "میرے پاس کوئی کہانی نہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"ارے یار۔" میں نے اطمینان دلانے کے لئے زری کی بات چھیڑ دی۔ "عجیب واقعہ ہوا ہے آج۔ بوندی سے واقف ہو نا۔ جو گڑیال کے قریب واقع ہے۔ وہاں سے راستہ بھول کر میں نہ جانے کہاں جا نکلا۔ وہاں ایک خوبصورت ڈھلان پر ایک سرخ جھونپڑی میں میری ان سے ملاقات ہوئی"۔

"وہ رنگین بڈھا، "زری کی بات کر رہے ہو"۔ وہ ہنسنے لگا۔ "بس خوب لوگ ہیں وہ سب۔ اس کی آنکھوں میں وہی رس کی بوندیاں ناچنے لگیں۔ گال تمتما اٹھے اور ہونٹ حسرت زدہ مسرت سے کھل گئے۔ "لیکن" وہ بولا "اگر تم ایبٹ آباد کی دادی اماں اور چیڑ دے منہ لگے اور کوہالہ کے عظمت سے ملو تو پاگل ہو جاؤ۔ بالکل پاگل۔ ان کے جھونپڑے کتنے سادہ ہیں اور کیسے خوبصورت مقامات پر بنے ہوئے ہیں اور ان کی طبیعتیں گویا اندھیری رات میں پھلجھڑیاں ہیں اور ان کی مہمان نوازی، محبت، اخلاق۔ وہ اس قدر مدھم آواز میں کہے جا رہا

تھا گویا مجھے سنانے کی بجائے خود وہ لمحات بیت رہا ہو۔ پھر وہ میری موجودگی سے بھی بے خبر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہاڑوں کی چوٹیاں لہرا رہی تھیں۔ بھویں تنی ہوئی تھیں۔ ہاتھ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے شرپا۔ کے۔ ٹو۔ کے خواب دیکھنے میں محو ہو۔ اور کے۔ ٹو۔ کے سرسبز ڈھلوانوں پر راہ سے بھٹکتے ہوئے سرخ جھونپڑوں میں سے زری، دادی اماں، مسٹر رانگلے اور عظمت خان اسے اشارے کر رہے ہوں۔

عمر ایک دلچسپ مجموعہ اضداد ہے۔ ازلی آوارہ ہونے کے باوجود اسے ان سرخ جھونپڑوں سے محبت ہے جن میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہوتی ہے۔ اور جہاں ہر وقت ہر راہ گیر کے لئے کافی اور کریم کا پیالا تیار رہتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں وہ افراد ملتے ہیں جو راستہ بھول آئے ہوں، جن کا برتاؤ بے حد غیر رسمی ہوتا ہے جو بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں اور جن کی گفتگو میں امریکی بے تکلفی اور انگریزی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ عمر کو انگریزی تہذیب اور دور حاضرہ کی ملمع سے عشق ہے۔ انہی وجوہ سے اس کی شخصیت میں ایک انوکھا دورخہ پن ہے۔ اور بسا اوقات یہ تضاد اس قدر نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ عمر کو دیکھ کر میں یہ محسوس کرنے لگتا ہوں کسی بن مانس (گوریلا) کو سوٹ پہنا کر ڈنر ٹیبل پر بٹھا دیا گیا ہو۔

اس تضاد کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دھرم سالہ کے اس آوارہ منش کو دہلی عربیک کالج میں تعلیم کے لئے بھیج دیا گیا اور یوں تن سنگ اور ھلیری گڈمڈ ہو گئے۔ بن مانس اور ڈنر سوٹ خلط ملط ہو گئے اور اس دلچسپ اختلاط سے آتشدان کے قریب تربونڈی کی برف۔ سراہ کے پھول۔ سحر ہونے تک پس پردہ میم صاحب، ذوقی اور مسلم ہوٹل سے افسانے پیدا ہوئے۔ جن کے پس منظر میں تن سنگی مناظر پھیلے ہوئے ہیں اور کلوز اپ میں ھلیریانہ کردار رقص کرتے ہیں اور ان کرداروں میں کوئی تن سنگی حسینہ ھلیریانہ انداز لئے پردہ سکیمں پر ظاہر ہوتی ہے اور پھر منظر پر پھولدار غالیچے بچھ جاتے ہیں اور جذبات کی گرد اڑتی ہے۔

عمر سے پوچھئے بھئی تم کہانی کس طرح لکھتے ہو تو وہ شرما جائے گا۔ جیسے کہانی لکھنا

جرم ہے، اگر اصرار کیا جائے تو مسکرا دے گا۔ "بس لکھ دیتا ہوں اور کیا۔" آخر کسی بات سے متاثر ہو کر ہی لکھتے ہو گے نا۔ "متاثر" وہ حیرانی سے آپ کی طرف دیکھے گا۔ بھئی یہ سب کچھ، یہ مناظر، یہ قہقہے، یہ آنسو جو جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ اور پلاٹ، پلاٹ تو خود بخود بن جاتا ہے خود بخود۔

عمر سے ایسے سوالات پوچھنا بے کار ہے کیونکہ اسے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کیوں اور کیا لکھتا ہے۔ اس کی تحریروں کو خیال یا سوچ بچار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ جذبات کے بل بوتے پر لکھتا ہے۔ اس نے کبھی افسانے کے مرکزی خیال کے متعلق سوچنے کی کوشش نہیں کی اور یہی اس کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔ اس کی کہانیاں مرکزی خیال سے بوجھل نہیں ہو پاتیں اور انہیں پڑھتے ہوئے قاری کو جذبات سے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ سوچے۔

بات کرتے ہوئے عمر چکیلے فقرے دہرانے کا عادی ہے۔ ایسے فقرے جو اس نے انگریزی کتابوں میں پڑھے ہوئے ہیں۔ مگر عمر اپنی افسانہ نویسی یا تحریک افسانہ نویسی کے متعلق کوئی جملہ کہہ دے تو یقین کیجئے اس کی حیثیت ہاتھی دانت کی سی ہو گی۔ عمر کے افسانے تحریک کے محتاج نہیں۔ گرد و پیش کے واقعات سے وہ عموماً بے گانہ رہتا ہے۔ اسے اپنی تن سنگیت سے فرصت نہیں ہوتی کہ گرد و پیش کی طرف دیکھ سکے۔ وہ راہ چلتے ہوئے عموماً راہ سے بھٹک کر کسی زری کے جھونپڑے کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ اور پھر ایک روز قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے اور یہ جانے بغیر کہ وہ "تربونڈی کی برف" لکھنے والا ہے یا "میم صاحب" بے سوچے سمجھے لکھے جاتا ہے۔ پھر اس کی آنکھوں تلے سرخ جھونپڑے آکھڑے ہوتے ہیں اور زری قہقہے لگاتے ہیں پھر کوئی دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور مینا کچھ کہے بغیر داخل ہو جاتی ہے اور اس کی شربتی آنکھوں سے رس کی بوندیاں برستی ہیں اور کرداروں کے ساتھ ساتھ قاری بھی بھیگ جاتا ہے۔

عمر کے افسانے درحقیقت اس کے عالم بے داری کے خواب ہیں اس کے افسانوں

میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اور وہ سب بلا کی شوخ اور تیز ہوتی ہیں اور محبت کی تحریک لڑکی کی طرف سے ہوتی ہے اور بے وفائی ہمیشہ مرد کی طرف سے۔ اس لحاظ سے عمر کے افسانے سنگیت کی ٹھمریاں ہیں جن میں اظہارِ محبت ہمیشہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور بے پروائی مرد کی طرف سے۔ عمر کے یہ جاگتے کے خواب اس کے سوتے خوابوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ نیند میں بھی وہ لڑکیوں کے جھرمٹ دیکھتا ہے اور وہ لڑکیاں اس پر ہنستی ہیں۔ اسے گدگداتی ہیں۔

افسانوں کے علاوہ جاگتے میں اس کا محبوب ترین خواب بھی شانِ محبوبیت کا غماز ہے وہ دیکھتا ہے کہ وہ مر چکا ہے اور اس کے جنازے کے گرد لوگ کھڑے اس کی باتیں سن رہے ہیں اور پھر اس کی موت کی خبر فلاں تک پہنچتی ہے اور پھر فلاں تک اور عمر چھپ کر کھڑا دیکھتا ہے اور سنتا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور یہ خبر سن کر ان کی کیا حالت ہوتی جاتی ہے۔

عمر سے اس جاگتے خواب کی وجہ پوچھو تو وہ کہے گا بھئی ظاہر ہے کہ مجھے اپنے دوستوں سے دلچسپی ہے اور اسی لئے میں ان کے جذبات سے واقف ہونے کا خواہش مند ہوں۔ عمر کو اس امر کا احساس نہیں کہ وہ اپنے دوستوں سے اس حد تک مایوس ہو چکا ہے کہ لاشعوری طور پر اسے یقین ہو چکا ہے کہ جیتے جی احباب نے اس کی قدر نہیں کی۔ البتہ اس کی موت کی خبر سن کر دفعتاً وہ چونک کر محسوس کریں گے کہ انہوں نے کیا کھو دیا وہ ایک لمحہ عمر کے لئے کس قدر فتح مندی کا ہوگا۔ اس لمحے کو حاصل کرنے کے لئے عمر مرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا اور پھر چوری چوری اپنے دوستوں کے بین سن کر خوش ہوگا۔ یہ خواہش ایک حرماں نصیب عاشق کی ہی ہو سکتی ہے۔ ایک ایسا عاشق جسے محبوب کی نسبت حرماں نصیبی سے زیادہ لگاؤ ہے۔ عمر ایک ایسا ہی عاشق ہے۔ لیکن اگر آپ اسے آئینہ کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھ لیں تو اس کے انہماک کو دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے اور محسوس کریں گے جیسے وہ عمر نہیں بلکہ پانی کے کنارے اگا ہوا نرگس کا پھول ہے۔

فرصت کا بیشتر وقت وہ بناؤ سنگار میں وقف کرتا ہے۔ خوبصورت کپڑے پہنتا ہے

مناسب ٹائی خریدنے کے لئے گھنٹوں دکانوں پر مارا مارا پھرتا ہے۔ ذرا سی کوفت محسوس کرنے پر غسل خانے کی طرف دوڑتا ہے اور منہ دھونے اور بال بنانے کے بعد از سر نو تازہ دم ہو جاتا ہے۔ مسلسل سوچ بچار کے باوجود آج تک میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ عمر کی شخصیت میں محروم عاشق کہاں ختم ہوتا ہے اور کہاں محبوب ابھرتا ہے۔ افسانوں میں اس کا اپنا مرتبہ محبوب کا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی ہیروئن محبت کی تحریک شروع کرتی ہے۔ مجھ سے ہر ست لذت پرست آدمی کو ایسی ہیروئن پسند ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اپنا افسانہ ''آپا'' لکھا تھا تو حسن عسکری نے مجھے ایک خط بھیجا تھا۔ جس میں برسبیل تذکرہ لکھا تھا ہمیں بھی کسی ساجو باجی کا پتہ لکھ بھیجو۔ عسکری کے خط سے مجھے ایک گونہ تسلی ہوگئی ورنہ میں حیران تھا کہ لوگ آپا کے کردار کو کیوں پسند کرتے ہیں۔

عمر کو چنچل ہیروئن اس لئے پسند نہیں جس وجہ سے وہ مجھے پسند ہے۔ کیونکہ عمر ست آدمی نہیں۔ البتہ وہ تو ضرورت سے زیادہ چست ہے۔ شاید اس کی وجہ محبوبیت ہو لیکن عمر کی شخصیت کو سمجھنا کچھ ایسا آسان نہیں۔ اس کی شخصیت دوسری جماعت کے بچے کی سی ہے جس میں رنگین بٹن، ٹوٹی ہوئی گھڑی کی چابی، چنے چاک سیاہی اور چمکیلے ورق بھرے ہوئے ہیں۔

عمر سے پوچھئے بھئی تمہیں کیا پسند ہے تو وہ غصہ سے آپ کی طرف دیکھے گا۔ '' کیا مطلب۔'' مجھے وہی پسند ہے جو قابل پسند ہے اور کیا۔ مجھے بارش پسند ہے، اندھیرا پسند ہے، بادل کی دھوڑی پیاری لگتی ہے اور برف جیسی سفید برف یہی قابل پسند چیزیں ہیں اور کیا۔ اور جھونپڑے کے دروازے پر کھڑی منتظر لڑکی۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''فضول باتیں۔'' اس نے غصہ میں منہ سے چنے کھونتے ہوئے کہا۔ ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا بھئی ایک بات کہوں تم سے، تحلیل لفظی کے اصولوں کے مطابق برف بادل اور بارش تینوں پھیلے پھیلے دھندلکوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور گہری تشویش اور اضطراب کے نشان ہیں۔ ''ہو نہیں'' اس نے غصہ سے میری طرف دیکھا اور بالوں کو ٹھیک کرتا ہوا اپنے کمرے

کی طرف چل دیا۔

جوانی میں میں ان لوگوں سے متاثر ہوتا تھا جو متوازن اور معقول تھے شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ اس زمانے میں صرف ان لوگوں کی عزت ہوا کرتی تھی جو رسمی نقطۂ نظر سے متوازن اور معقول ہوتے تھے اور صرف ان ہی کی بات کو درخور اعتنا مانا جاتا تھا۔ اسی لئے میں نے مطالعہ کی ابتدا فلسفہ سے کی اور اب جبکہ میری حسیات منجمد ہو چکی ہیں جبکہ میں خود اپنے ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ چکا ہوں۔ میں ان افراد سے متاثر ہوتا ہوں جن کی شخصیت میں جذبات کا مدوجزر ہو، زندگی کی فراوانی ہو۔

چند روز عمر کے ساتھ رہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بھرپور زندگی کا مالک ہے۔ اس محرومیت کے باوجود اس کے چہرے پر چھائی رہتی ہے۔ اس جھجک کے باوجود جو اسے بظاہر روکے رکھتی ہے۔ اس نامانسیت کے باوجود جو اکثر اس پر مسلط رہتی ہے۔ اس کی زندگی بھرپور ہے۔ دفتر کو جاتے ہوئے وہ کسی عمودی چٹان کی طرف دیکھ کر رک جاتا ہے تم چلو میں یہ شارٹ کٹ کروں گا۔

شارٹ کٹ۔ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا۔

ہاں ہاں میں یہ شارٹ کٹ ٹرائی کرتا ہوں۔ مشکل ہے مگر کتنا مزہ رہے گا۔ وہ بوٹ اتار کر بندر کی طرح چڑھنے لگتا ہے۔

آدھی رات کے وقت وہ نیند سے بیدار ہو کر کوٹ پہن لیتا، کیوں بھئی وہ مجھے جھنجوڑ کر جگاتا۔ باہر چکر لگانے کے لئے چلو گے۔

ہائیں اس وقت برف باری میں، میں حیرانی سے اسکا منہ دیکھتا۔

اس وقت سیر کا موڈ ہے باہر بلا کی چاندنی ہے اور وہ سامنے والا پہاڑ الف یوں ایستادہ ہے۔ اس چاندنی میں جیسے سائن کلرک کا ایک دلکش منظر ہو۔ اچھا میں چلتا ہوں یہ کہہ کر وہ سونٹا اٹھا کر باہر نکل جاتا ہے۔

کسی اشد ضروری کام کو جاتے ہوئے سینما کا پوسٹر دیکھ کر دفعتاً وہ رک جاتا ہے۔ آؤ

یار شو دیکھیں۔

"ارے" میں حیرانی سے کی طرف دیکھتا اور وہ کام۔

چھوڑو یار اس وقت سینما دیکھنے کا موڈ ہے چلو۔

اس کی ایسی بے تکی باتیں سنکر بسا اوقات میں محسوس کرتا جیسے وہ عمر نہیں بلکہ عنفوانِ شباب سے سرشار ایک الہڑ دوشیزہ ہے جو موڈ کے سہارے کے بغیر جی نہیں سکتی۔ اور میں اس کا کوٹ بردار ہوں۔ پھر حسینہ کی جگہ عمر کا محروم اور ڈھلکا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے غصہ آ جاتا۔

ان دنوں مہینے کے آخری دن تھے۔ صبح سویرے ہی وہ میرے پاس آیا آج سینما دیکھنے کا موڈ ہے وہ بولا۔

کوئی خاص فلم چل رہی ہے کیا۔

نہیں تو وہ مسکرایا ویسے ہی سینما دیکھنے کا موڈ ہے۔

یہ تمہارے موڈ کیسے بنتے اور بگڑتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

آ بھی جائے وہ بولا تو کیا فرق پڑے گا۔ لیکن دقت یہ ہے کہ پیسہ نہیں ہے کوئی۔ تم کہو ہے کچھ۔

یہاں بھی اللہ کا نام ہے میں نے جواب دیا۔

کچھ پروا نہیں۔ دفعتاً شرپا نمودار ہوا۔ کر لوں گا میں۔

اگر نہ ہوا تو۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ہنسا اور باہر نکل گیا۔

سارا دن وہ نہ جانے کہاں کہاں گھومتا پھرا۔ دوپہر کے قریب آ نمودار ہوا ہو گیا بھئی اس نے پانچ کا نوٹ یوں لہرایا جیسے وہ بس اس کی کامیابی کا جھنڈا ہو۔

شام کو ہم دونوں سینما کی طرف چل دیئے۔ موڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ میں نے کہا ادھر سے کیوں نہ چلیں یہ شارٹ کٹ ہے۔ راستے میں لال بٹن والیوں کے بازار سے گزرنے

کی کوفت سے بچ جائیں گے۔ اونہہ، وہ بولا لال بٹن والیوں کا بازار ہے تو پھر کیا ہوا۔ لال بٹن والیوں کے بازار میں وہ رک گیا۔ وہ دیکھو وہ سرخ دوپٹہ والی بے چاری کس قدر مغموم بیٹھی ہے یار مجھے ترس آتا ہے یہ کیا عیش پرستی کی جگہ ہے۔ لاحول ولا قوۃ، دیکھو تو کتنی اداسی چھائی ہے۔ حسرت کی تصاویر ہیں یہ سب۔ اچھا میں ذرا اس سالی سے بات تو کروں۔ وہ چلا گیا اور چار ایک منٹ ایک لال ٹین کے قریب کھڑا ہو کر اس سے باتیں کرتا رہا۔

پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے پاس یوں پہنچا جیسے کوئی تازہ ایورسٹ سر کر کے آیا ہو۔ چلو بھئی وہ بولا چلو سینما لو۔

سینما گھر کے بکنگ آفس کے قریب وہ دفعتاً گھبرا گیا اور جیب ٹٹولتے ہوئے۔

قہقہہ مار کر ہنسا۔ چلو یار گھر چلیں۔ وہ چلایا چلو۔

کیوں میں نے پوچھا کیا سینما کا موڈ نہیں رہا۔

نہیں، وہ بولا، پیسہ ہی نہیں کوئی۔

اور وہ پانچ کا نوٹ؟ میں نے پوچھا۔

یار وہ تو میں نے اس کو دیدیا تھا۔ بے چاری کسمپرسی کی حالت میں تھی۔

وہیں بتادیا ہوتا، میں نے غصہ میں کہا۔

مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ وہ غصے میں چلایا۔ ایسے جملے کو غصہ میں ادا کرنا عمر ہی کا حصہ ہے۔ آج تک مجھے صرف ایک واحد شخص سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے جو "مجھے معاف کردو" کہتے ہوئے منہ سے غصے کی جھاگ نکال سکتا ہے۔

رہا عقل و دلیل کا سوال تو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ عمر کو دلیل سے قائل کرنے کی بجائے آپ کوئی اور شغل فرمالیں تو بہتر ہوگا۔ تین سال گزرے ہیں جب میں نے اسے دلیل سے سمجھانے کی آخری کوشش کی تھی۔ زیر بحث موضوع کیا تھا یہ مجھے یاد نہیں۔ میں نے بات کو مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا تھا، دیکھو میری جان سیدھی سی بات ہے اگر تمام کوے کالے ہوں۔

اگر کیوں وہ چلایا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ سبھی کالے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا بھائی جان فرض کرلو۔

خواہ مخواہ فضول وقت ضائع کروں میں فرض کرنے میں لاحول ولا قوۃ۔ یہ کہتے ہوئے اس کے منہ سے تھوک کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں اور وہ یوں ہاتھ چلانے لگا جیسے تلوار سے ڈوئل کھیلنے کی تیاری کررہا ہو۔ اس کے بعد میں نے اسے دلیل سے سمجھانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی اگرچہ مسعود کا اب بھی یہ خیال ہے کہ غلطی میری تھی مجھے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے میری جان نہیں کہنا چاہئے تھا۔ بہر حال اس روز سے میں اسے بڑی احتیاط سے خطاب کرتا ہوں۔

عمر "اگر" کا قائل نہیں۔ وہ فرض نہیں کرتا۔ بلکہ صرف وہی بات کرتا ہے جو اس کے نزدیک حقیقت ہے اور اس کے نزدیک وہی حقیقت ہے جو وہ محسوس کرتا ہے۔ وہ محسوسات کا ایک پلندہ ہے، محسوسات ہی اس کا اوڑھنا اور وہی اس کا بچھونا ہیں۔ اس کیلئے سب سے بڑی دلیل جذبات سے بھرا ہوا ایک نقطہ ہے۔ جذبات سے چھلکتی ہوئی ایک جنبش ہے اور وہ اس جنبش اور ایک نقطہ کو حاصل کرنے کیلئے سرگرداں ہے۔ لڑکی کی ایک اثباتی مسکراہٹ دیکھنے کیلئے وہ میلوں کا سفر طے کرنے کیلئے تیار ہے۔ ایک دوستانہ گونگا اشارہ دیکھنے کیلئے وہ گھنٹوں انتظار کرسکتا ہے۔ لیکن اس بھری ہوئی دنیا میں جب تنہائی کے احساس کی شدت اسے بے قرار کردیتی ہے تو اس کی شخصیت کا "بھگوڑا شرپا" باہر نکل آتا ہے اور ایسی حالت میں یا تو وہ اپنا سونٹا پکڑ کر مری کی کسی چوٹی کی طرف نکل جاتا ہے اور یا قلم اٹھا کر کمرے میں آنکھیں موند کر ان وادیوں میں جا پہنچتا ہے جہاں سبھی راستہ بھول کر بھٹک کر آنکلے ہوتے ہیں۔ جہاں سبزے کی جگہ غالیچے بچھے ہوتے ہیں۔ جن سے جذبات کی گرد اڑتی ہے اور پھر کوئی "مینا" نمودار ہوتی ہے۔ جیتی جاگتی مینا۔ اور پھر شربتی آنکھوں سے رس کی بوندیں اڑتی ہیں اور کرداروں کے ساتھ قاری بھی بھیگ جاتا ہے۔

بانو قدسیہ

اور شہرِ بے مثال

شہرِ بے مثال بانو قدسیہ کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اس ناول میں کہی، ان کہی، کئی ایک کہانیوں کی رنگین لڑیاں ہیں جو مرکزی کہانی کے تنے سے پھولدار شاخوں کی طرح پھوٹ کر ادھر اُدھر نکل گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں چند ایک رنگ برنگ کے جیتے جاگتے رستے بستے ماحول ہیں اور کئی ایک چلتے پھرتے ہنستے شوخ اور جاذب کردار۔ ان کرداروں کے جھرمٹ میں ایک سہما سمٹا ہوا شہر ہے۔ جیسے اپنی ہی تخلیق کردہ مخلوق پر حیران ہو۔ اور ان سب کے اوپر چھائی ہوئی فضا میں مصنفہ کا اڑتا ہوا دھاری دار آنچل۔ ہنرکار ہاتھ اور شوخ اشارات کی سینکڑوں، ہزاروں پھلجھڑیاں، جن کی کرنوں میں شہر کی پھلکاری کے گوناگوں پھولوں کی پنکھڑیاں اُبھرتی ہیں۔ رنگ اور نقش کی ایک بھیڑ لگ جاتی ہے اور قاری کے دل میں پھر سے جینے کی آرزو انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔

ستر کی چادر میں ملبوس، نووارد، سہمی ہوئی معصوم پاکیزہ کبوتری۔۔۔ رشو، شہر کی فضا میں رچی بسی، امریکی اشتہار کی طرح مجلّے، سومبر رچانے کی دلدادہ۔ لیکن دکھلاوے اور مصلحت کی پرستار۔۔۔ ڈمپل۔

چھیڑ چھاڑ کی رنگ پچکاری اٹھائے قلقل قہقہے مارتی، زقند بھرتی، چوٹی کا سپنولیہ لہراتی، کچی عمر کا پٹاخہ۔۔۔ انوری۔

اللہ میاں کی گائے اور جہاندیدہ طوائف کا پراسرار امتزاج۔۔۔ گلنار

بٹیل کے روپ میں شدت پسند، کان چروا کر مندرے ڈلوانے کا شوقین دھیدو۔۔ ظفر آرائچ فیکٹر بگڑے ہوئے گھر میں حکم کے ساتھ تخلیئے میں تاک ٹوئیاں مارنے والا غازی افسر کلرک۔۔۔ خانو جمال۔

جسم اور خیالی نقطے کی بنیاد پر قائم ہونے والا غیر فطری جوڑا۔۔۔ ط ظ۔

طوائف سے خالی سر پر تیل لگوا کر، سرمہ ڈلوا کر، خوشی خوشی گھر لوٹنے والا بدھو۔۔۔ غازی۔

نوجوان جوڑوں کا ملاپ کرا کر ان کی توجہ کا مرکز بننے کی شوقین ملازم بڑھی۔۔۔ خالہ فیروزہ۔

بڑے میک اپ اور ہیروئنوں سے وضع کی ہوئی ماڈرن لڑکیاں جن کے وجود سے کپڑے اور پنیں نکال لو تو باقی فالودہ رہ جاتا ہے۔ تین دن کا باسی فالودہ۔

اپنی زندگی کے سٹوپا سے باہر نکلنے کے شوقین اور چیک بک کی مدد سے شنکر چورناگ کو رام کرنے کے خواب دیکھنے والا۔۔۔ ملک۔۔ اور سرین کے بل بوتے پر توجہ جذب کرنے کا خواہاں۔۔۔ شہرِ بے مثال۔

بے شک شہرِ بے مثال میں بڑی گہما گہمی ہے لیکن جب مصنفہ خود پچکاری اٹھائے داخل ہوتی ہے تو کردار ماحول اور شہر سب معدوم ہو جاتے ہیں۔

وہ چپ چاپ آ نکلتی ہے۔ انگلی پکڑ کر آپ کو لے چلتی ہے۔ ایک ایک کردار سے تعارف کراتی ہے۔ ماحول کی جزئیات میں رنگ بھرتی ہے۔ سادہ سپاٹ روزمرہ کی تفصیلات میں کلیاں ٹانکتی ہے۔ رنگ پچکاریاں چلاتی ہے۔ آپ انبساط بھری حیرت سے چونکتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں آپ کردار، ماحول اور شہر سب دھندلا چکے ہیں، صرف مصنفہ اور اس کی رنگ پچکاری۔

ہاں اس ناول کی سب سے بڑی خصوصیت (چاہے آپ اسے خوبی گردانیں یا خامی) یہ ہے کہ جوں جوں آپ اسے پڑھتے جاتے ہیں توں توں الفاظ میں سے تراکیب میں سے۔

اشارات میں سے، استعاروں سے، انداز بیان سے، تشبیہات سے، Insertions سے نہ جانے کہاں کہاں سے مصنفہ ابھرتی ہے۔ ابھرے چلی آتی ہے۔ جیسے کہ وہ شہ بے مثال کے سارے ماحول پر چھا جاتی ہے اور آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ جملہ ماحول سے رنگین تر ہے، جملہ کرداروں سے جاذب تر۔ یہ خصوصیت صرف مصنفہ سے ہی منسوب نہیں بلکہ خود بانو قدسیہ کی شخصیت کا بنیادی اور مرکزی پہلو ہے۔

شاید آپ کو کبھی اشفاق احمد سے ملنے کا اتفاق ہوا ہو۔ نہیں ہوا تو کبھی فرصت کے وقت ان کے ہاں جائیے۔ اشفاق آپ سے تپاک سے ملے گا۔ جلد ہی اس کی باتوں کی بے تکلفی، سادگی اور دلچسپی آپ کو جذب کر لے گی۔ اشفاق باتوں کا رسیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی باتوں کے جال میں پھنس کر آپ کو یہ پتہ بھی نہ چلے کہ کمرے میں ایک سادہ سی گھریلو سی نیم میلی سی، بے زبان سی عورت داخل ہو چکی ہے۔ ایک ایسی عورت جو آپ کی توجہ جذب کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ ایک ایسی عورت جس کی طرف دیکھنے پر آپ اپنے آپ کو مجبور نہیں پاتے۔ جسے ایک نظر دیکھنے کے بعد آپ آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو چائے کا پیالہ پیش کر رہی ہے۔ اخلاقاً آپ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ وہ خوش اخلاقی سے دو ایک رسمی باتیں کرے گی اور پھر یا تو کمرے سے باہر چلی جائے گی یا وہیں کسی کونے میں مودبانہ بیٹھ کر معدوم ہو جائے گی۔ آپ کی باتوں میں لقمہ نہیں دے گی۔ آپ کی بحث میں حصہ نہ لے گی۔ اپنی حرکات و سکنات سے یہ ظاہر نہیں کرے گی کہ زیر بحث موضوع پر اسے بھی کچھ کہنا ہے البتہ اس کے انداز سے ظاہر ہوگا کہ وہ بات کو کچھ کچھ سمجھ رہی ہے۔ اخلاقاً سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ اس کی بے توجہی سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔

اول تو اس بے چاری چیونٹی کے متعلق آپ سوچیں گے ہی نہیں۔ اگر خیال آ بھی جائے تو آپ محسوس کریں گے "کتنی اچھی ہے بے چاری"۔

لیکن اگر آپ دو چار دن اشفاق کے گھر میں قیام کریں تو آپ دیکھیں گے کہ "یہ

کتنی ہے بے چاری"۔ کونوں سے نکل نکل کر پھیلی جا رہی ہے۔ ابھر رہی ہے۔ پھیلے جا رہی ہے حتیٰ کہ سارا گھر بانو قدسیہ سے بھر جائے گا۔

آپ دیکھیں گے ابھی وہ ادھر بیٹھی ڈرامہ لکھ رہی تھی۔ ابھی ادھر چھوٹے سرمد کو کپڑے پہنا رہی ہے۔ ابھی وہ تو باورچی خانے میں شلغم کا اچار تیار کر رہی ہے۔ وہ وہ تو برآمدہ میں مشین پر بیٹھے ہوئے محمد شاہ رنگیلے گنگنا رہی ہے یا صحن میں آم کی قلمیں لگاتے ہوئے نوکر کو زمین کی پیمائش کا مسئلہ سمجھا رہی ہے۔ ابھی وہ اتیقو کے پاس بیٹھی ڈرل کی شکل پر تحقیق کر رہی تھی۔ ابھی ڈرائنگ روم میں بجی سجائی گڑیوں کے ساتھ بے مقصد رسمی مہمل باتوں پر گھاگ دنیادار کی طرح یوں محظوظ ہو رہی ہے جیسے واقعی حظ اٹھا رہی ہو۔ اب وہ تو چادر کی بکل مارے پرانی بی کے حضور میں مودبانہ کھڑی ان سے پڑوسن سے جا کر ملنے کی آگیا لے رہی ہے۔

پتہ نہیں کیسے وہ ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ ہر بات میں دلچسپی لیتی ہے۔ ہر موضوع پر صائب رائے رکھتی ہے۔ ہر کھیل میں بچوں کی طرح شامل ہو جاتی ہے۔ ہر بات میں پیش پیش ہے اس کے سامنے گھر کے سارے کردار معدوم ہو جاتے ہیں۔ ساری چیزیں اپنی جاذبیت کھو دیتی ہیں۔

چند ایک سال ہوئے ہم چار دوست عمر، مسعود، عبداللہ اور میں تفریح کے لئے کاغان گئے تھے۔ ناران کے قریب ایک جوار میں غیر علاقے میں گھومتے پھرتے ہمیں ایک کوہستانی مل گیا۔ اس سے ہم نے کوہستانی زیرے کی پاؤ بھر کی ایک پوٹلی خریدی۔ دراصل یہ پوٹلی ہم نے خوشی سے نہیں خریدی تھی نہ ہی ہم زیرے کے شوقین تھے۔ کوہستانی کے قدامت کی ہیبت اور اس کے چہرے کی خونخواری دیکھ کر ہم وہ پوٹلی خریدنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

شام کے وقت ہوٹل میں پہنچ کر ہم نے پوٹلی کو میز پر رکھ دیا اور کھانا کھا کر سو گئے۔ پچھلے پہر ہم سب جاگ رہے تھے۔ مسعود بولا "یار کمرے میں کیا ہے آج"۔ عمر نے جواب دیا۔ "ہاں یار کمرے میں بہت کچھ ہے آج"۔ میں نے کہا "ہاں بھئی کچھ ہے جو نیند نہیں آ

رہی"۔ عبداللہ بولا "کچھ نہیں بھائی کوہستانی زیرے کی پوٹلی ہے سو جاؤ آرام سے"۔

صبح اٹھے تو سارا کمرہ کوہستانی زیرے سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ "ناشتہ کرنے لگے تو انڈا کوہستانی زیرے کا بنا ہوا تھا۔ چائے میں پتی ڈالنے کی بجائے باورچی نے زیرہ ڈال رکھا تھا۔ پانی گویا زیرے کا عرق تھا۔ سگریٹ میں تمباکو کی نہیں بلکہ زیرے کی پتی بھری ہوئی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ مسعود نے کہا "ٹھہرو" وہ چپکے سے اٹھا میز کے قریب گیا۔ دو انگلیوں سے زیرے کی پوٹلی یوں اٹھائی جیسے مرا ہوا چوہا ہو اور کھڑکی کھول کر اسے دریا میں پھینک دیا۔ پھر ہاتھ جھاڑ کر واپس کرسی پر آبیٹھا۔

اس کے باوجود اس روز سارا دن ہم کوہستانی زیرہ کھاتے رہے۔ کوہستانی زیرہ پیتے رہے اور شام کو کوہستانی زیرے کے ڈھیر میں سو گئے۔

قدسیہ اور اس پوٹلی میں فرق صرف یہ ہے کہ زیرے کی پوٹلی اپنا راز فاش کر دیتی ہے اور اسے پھینکا جا سکتا ہے۔

اشفاق احمد کے گھر بے شک جائیے۔ لیکن میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہاں قیام نہ کیجئے ورنہ گھر لوٹ کر بھی آپ قدسیہ دیکھیں گے۔ قدسیہ سوچیں گے، قدسیہ محسوس کریں گے اور آپ کو یہ احساس بھی نہ ہوگا کہ آپ قدسیہ جی رہے ہیں۔

قدسیہ کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے اٹھارہ سال ہو چکے ہیں۔ ان میں چھ برس وہ بھی شامل ہیں جب میں نے قدسیہ بانو کو دیکھا تک نہ تھا۔ اشفاق احمد شہر بے مثال کے ہیرو ظفر سے قطعی مختلف ہے۔ ظفر کے کردار میں شدت اور عشق ہے۔ اشفاق میں نہ شدت ہے نہ عشق۔ اشفاق میں شعلہ نہیں۔ چنگاری ہے۔ راکھ میں دبی ہوئی چنگاری نہ جانے بانو کا فلیتہ اس چنگاری تک کیسے پہنچا۔ لیکن جونہی پہنچا گونگے محمد حسین مرحوم نے اسے محسوس کر کے کہا "مفتی جی۔۔۔ کچھ ہے"؟ میں نے جواب دیا "ہاں محمد حسین کچھ ہے"۔

یہ "کچھ" بے حد مبہم ہونے کے باوجود قطعی طور پر واضح تھا۔ جیسے سورج طلوع ہونے سے پہلے سفیدی پھیل جاتی ہے اگرچہ ہمیں یہ علم نہ ہو وہ "کچھ" "کون" ہے۔ کیسی ہے

کہاں ہے۔ لیکن اس کا ہونا ہم نے بغیر کسی ثبوت کے بغیر کسی دلیل کے تسلیم کر لیا۔

پھر آہستہ آہستہ اشفاق کی خاموشی نے زیرے کی اس پوٹلی کو ہوا دی جسے وہ سینے میں دبائے بیٹھا تھا اور سارا گھر زیرے سے بھر گیا یوں ہم بانو قدسیہ سے متعارف ہوئے۔ اشفاق باتوں کا رسیا ہے لیکن کسی موضوع سے اگر اس کا جذباتی تعلق ہو جائے تو وہ اس موضوع پر چپ ہو جاتا ہے۔ اشفاق کی شخصیت اور اس کی قلبی آپ بیتیوں کو جاننے کیلئے تلقین شاہ جی کی باتیں نہ سنیئے۔ اس کی چپ کو سنیئے۔ اس کی چپ ویسے ہی بہت متکلم ہے۔ زیرے کی پوٹلی نے اشفاق کی خاموشی کو بالکل ہی بیکار کر دیا تھا۔ اگرچہ چنگاری پھر بھی منظر عام پر نہ آئی تھی۔ البتہ اشفاق نے اس پر مزید راکھ ڈالنی شروع کر دی تھی۔ بہر حال چنگاری کی تپش میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ ہم دونوں جو اشفاق کے قریب رہتے تھے جلنے لگے۔ پھر اس جلن میں ایسا مزا آیا کہ محمد حسین اور میں دونوں نے اس کانگڑی کو تاپنا شروع کر دیا۔

ایک وسیع و عریض بلڈنگ کی تیسری منزل کی نیم چھتی میں ہم تینوں بیٹھے تھے۔ اشفاق نے چپ کی بغل میں کانگڑی چھپا رکھی تھی۔ گونگا محمد حسین بے بسی بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتا اور آہ بھر کر زیرِ لب کہتا "مفتی جی کچھ کرنا چاہیے"۔ اور میں اشفاق کی طرف دیکھ کر پوچھتا "کیوں اشفاق"۔ اور اشفاق چپ چاپ بانو قدسیہ کی بھیجی ہوئی کالی بلی کے سر کو سہلاتا رہتا جس کے ماتھے پر پنجے کا سفید نشان تھا۔

اشفاق کے ارد گرد لاہور کا شہر بے مثال پھیلا ہوا تھا۔ شہر کی چیونٹی کو ابھی پر نہیں لگے تھے۔ ابھی وہ سرین کے حربے سے واقف نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں شہر کا آنچل نیا نیا اڑا تھا۔ بے حجابی کا آفتاب ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ چاروں طرف حجاب اور بے حجابی کی دھوپ چھاؤں پھیلی ہوئی تھی۔

اس سہ منزلہ بلڈنگ میں کئی ایک ڈمپلز سوئمبر رچانے کیلئے آتیں۔ اعلیٰ نسل کی گوری چٹی گائیاں آ کر قلقل قہقہے مارتیں۔ لیکن کسی کو علم نہ ہوتا کہ وہ بظاہر رنگیلا اور بے پروا نوجوان کان چھدوا کر مُندرے پہنے بیٹھا ہے۔ ان دنوں اشفاق، قدسیہ کے آفتاب سے منور تھا

اور ہم دونوں اس کی منعکس چاندنی کے سحر میں بھیگے ہوئے تھے۔ اشفاق اس بلڈنگ میں رہا کرتا تھا جس میں شہرِ بے مثال میں ہیرو ظفر اور اس کے والد ملک صاحب مقیم تھے۔

"ظفر گھر پہنچا تو ہمیشہ کی طرح گھر پر میلے کی سی ہڑبونگ چھائی تھی۔ یہ ایک برادری کا سردار خاندان تھا۔ آنگن میں ماں کھڑی چارپائی پر بیٹھی پرات بھر پیاز کاٹ رہی تھیں۔ پاس ہی چھوٹی توپ جیسے جسموں والی تائیاں، ممانیاں، خالائیں بیٹھی تھیں۔ یہ عورتیں اب صرف ٹیپ ریکارڈرز تھیں۔ اور ان پر جوان لڑکیوں کی بے حیائی زچہ بچہ کے قصے، مروجہ پود کی بے سروپا باتیں۔ غیر موجود عورتوں کی بدگوئیاں۔ بچوں کی شوخ چشمیوں کی تفصیلات کے ریکارڈ چڑھے ہوئے تھے۔ جوان لڑکیاں جو ان معمر عورتوں کے ساتھ آئی تھیں۔ ظفر کو دیکھتے ہی پھڑ پھڑاتیں فاختائیں سی اڑنے لگتیں۔ پراسرار قہقہے بلند ہوتے۔ کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔ ظفر کی تو جان پر بن جاتی۔

"دوسری منزل شادی شدہ عورتوں کیلئے مخصوص تھی۔ پوتڑوں، کیوڑی کیوڑا کی ملی جلی خوشبوئیں، غسل خانوں میں چھوٹے چھوٹے ان دھلے جانگیے، فراکیں اور پاجامے، باہر چھوٹے چھوٹے کموڈ پڑے تھے۔ اندر بکسوں میں طلائی زیور، ریشمی پارچہ جات، فرانسیسی سینٹ، تیسری منزل پر ظفر اور اس کے اباجی رہتے تھے"۔

فرق صرف یہ تھا یہاں تیسری منزل پر صرف اشفاق رہتا تھا۔ اشفاق کے والد محترم پرانی وضع کے بزرگ تھے جو رکھ رکھاؤ اور خاندانی عزت و وقار کے شدت سے قائل تھے۔ پنشن یافتہ ہونے کے باوجود ریٹائر نہیں ہوئے تھے اور ساری بلڈنگ میں ان کا سکہ چلتا تھا۔

تیسری منزل میں دو نیم چھت کمرے تھے ایک مختصر سا صحن اور ایک گھومتا ہوا زینہ جو سیدھا اوپر پہنچتا تھا۔ جسے باقی گھر والے استعمال نہیں کرتے تھے۔

جغرافیہ کے لحاظ سے یہ تیسری منزل رابن کروسو کے جزیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس میں اشفاق اور بانو کی کالی بلی مقیم تھے۔ اگرچہ یہ کمرے کتابوں، ادھوری پینٹنگز اور

مختلف قسم کے گیجٹوں سے لدے ہوئے تھے۔ لیکن جب بھی محمد حسین اور میں اشفاق سے ملنے جاتے تو ہم محسوس کرتے کہ سارا گھر کالی بلی سے بھرا ہوا ہے۔

قدسیہ اور اشفاق کے ملاپ میں تین باتیں حائل تھیں۔ پہلی یہ کہ اشفاق ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اہل خانہ کا ایمان تھا کہ کوئی دوسرا خاندان ان کا ہمسر نہیں۔ دوسری یہ کہ اشفاق کی طبعی خاموشی ناقابل تسخیر تھی اور اس کی قوتِ برداشت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ تیسری یہ کہ قدسیہ میں خودداری کا جذبہ باقی جملہ جذبات پر حاوی تھا۔ ان تینوں طاقتوں کے مقابلے میں صرف ایک قوت برسرِ پیکار تھی۔ وہی قوت جو شہرِ بے مثال پر چھائی ہوئی ہے۔ قدسیہ کی شخصیت، کوہستانی زیرے کی پوٹلی۔

چھ سال بیت گئے۔

چھ سال اشفاق گم صم ہو کر بیٹھا رہا۔ اس کی قوت برداشت کا سرا دکھائی نہ دیا۔ چھ سال محمد حسین آہیں بھر بھر کر پوچھتا رہا۔ "مفتی جی کیا کریں"۔ اور میں اشفاق سے کہتا رہا "کیوں اشفاق"؟ اور اشفاق چپ چاپ کالی بلی کا سر کھجاتا رہا۔ چھ سال بلڈنگ کی تیسری منزل آہیں کھینچتی رہی۔ سسکیاں بھرتی رہی اور چھ سال ان نیم چھت کے کمروں میں بانو میلہ گھومنی کی طرح ادھر سے اُدھر چٹکیاں بجاتی ہوئی گھومتی پھرتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، فاتحانہ مسکراہٹ۔

یہی فاتحانہ مسکراہٹ تمام رکاوٹوں پر غالب آگئی اور قدسیہ اور اشفاق رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں ہجرت کرنی پڑی۔ برہمنوں نے اعلان کر دیا کہ وہ شودر ہیں اور جو کوئی ان سے راہ و رسم رکھے گا اس کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔ اور وہ برہمنوں سے میل ملاپ کرنے جوگا نہ سمجھا جائے گا۔

لیکن آج جب بھی کوئی اہم واقعہ ہو جائے یا مشکل پڑ جائے تو برہمن اس شودر مہارانی کو سندیس بھیج کر بلاتے ہیں۔ اس کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ اس کی رائے سب کی رائے پر فوقیت رکھتی ہے۔ جب شودر مہارانی برہمنوں کے گھر میں داخل

ہوتی ہے تو دروازے کی دلہیز پر قفل ٹکایا جاتا ہے۔

جب باہمنی ماں جی کا بلاوا آتا ہے۔ شودر مہارانی کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اک افراتفری کا عالم بپا ہو جاتا ہے۔ کہیں ماں جی کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ اللہ جلدی کرو اشفاق۔ اس کے رویے میں مزید عجز و انکساری کے پیوند لگ جاتے ہیں۔ مہارانی کے شودر پن پر نیا جوبن آتے دیکھ کر کبھی کبھار مجھے شک پڑتا ہے کہ کہیں شودر مہارانی برہمنوں سے انتقام تو نہیں لے رہی۔

مجھے یاد ہے جب بانو قدسیہ نئی نئی اشفاق کے گھر آئی تھی۔ اس زمانے میں اشفاق گڈریے کا سونٹا ہاتھ میں لئے پھرتا تھا۔ کہہ دینا اس کی فطرت میں نہیں۔ لیکن جب بھی قدسیہ کسی ادبی موضوع پر بات کرتی تو اشفاق کا رویہ کچھ ایسا ہوتا کہ میری جان آلو چھیلو، خانزادوں کے پوتڑے دھوؤ، پتی کے سلیپر ڈھونڈ کر ٹھکانے پر رکھو۔ ادب کی بات چھوڑو۔

یہ کینچوی چپ چاپ رینگتی رہی وہ گڈریے کے سونٹے سے بچ بچ کر رینگتی رہی۔ رینگتے رینگتے وہ براڈ کاسٹنگ ہاوس تک جا پہنچی۔ رینگتے رینگتے وہ ادبی جریدوں پر جا چڑھی۔ ڈراما کی سٹیج پر جا پہنچی اور پھر دفعتاً کایا پلٹ کر شہر بے مثال کی فضاؤں میں رنگین تتلی کی طرح اڑنے لگی۔

اب، جب اشفاق تلقین شاہ کا مرصع چغہ پہنے گڈریے کا سونٹا پکڑے مبہم مگر واضح برتری کی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے کہتا ہے۔ "قدسیہ کبھی فرصت ملے تو تمہاری شہر بے مثال پڑھوں گا"۔ تو جواب میں قدسیہ کے رویے پر عجز و انکساری کے مزید پیوند لگ جاتے ہیں۔ مہارانی کے شودر پن پر بہار آجاتی ہے اور وہ برہمن پتی مہاراج کے سامنے سیس نوا کر کہتی ہے "جیسے بھی آپ چاہیں پتی دیو" اس وقت اسے دیکھ کر مجھے شک پڑتا ہے کہیں شودر مہارانی برہمن دیوتا کو "کچھ کر کے تو نہیں دکھا رہی"۔

معلوم نہیں کیوں بانو سے غائبانہ متعارف ہونے کے دن سے آج تک میں درپردہ غیر شعوری طور پر اسے ہندو دیوی سمجھتا رہا ہوں۔ جب وہ نیم چھت کی تیسری منزل میں

چٹکیاں مارتی ہوئی گھومتی پھرتی تھی تو اس کے ماتھے پر سیندور کی بندی صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بعد جب کبھی میں میرا کا بھجن "میرو تو گردھر گوپال" سنتا تو پیش منظر میں بانو آکھڑی ہوتی۔ اب بھی جب چنگیر اٹھائے وہ باورچی خانے کی طرف جارہی ہوتی ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پوجا کی تھالی پکڑے مندر میں بھینٹ چڑھانے جارہی ہو۔ جن دنوں اس بلڈنگ کی تیسری منزل میں اشفاق اپنے ہونٹ سیئے، آنکھیں موندے دھرنا مارے بیٹھا تھا اور بانو ماتھے پر بندی لگائے اس کے گرد گھومتی پھرتی تھی تو مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے راج نرتکی مہارشی یوگی کا گیان دھیان توڑنے کیلئے پریم ناچ ناچ رہی ہو۔ اس ہندنی میں دیوی بھی ہے ناری بھی۔ جیسے شکنتلا ساوتری اور راج نرتکی ایک ہی پردے میں اکٹھے ہوگئے ہوں۔

تنہائی میں بیٹھے ان جانے میں شدھ راگ گنگنانا اس کی پرانی عادت ہے۔ ان کی حرکات ہر وقت مناسب لے میں ڈھلی رہتی ہیں۔ کتھک اور کتھا کلی ناچ کے کئی ایک مدار اسے ابھی تک یاد ہیں۔ حالانکہ کلاسیکی ناچ کی تربیت لئے اسے ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ اس کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں کو یکجا کر دیا جائے تو گیشیا جنم لیتی ہے۔

کبھی کبھار میں محسوس کرتا ہوں جیسے پچھلے جنم کی اس نرتکی کو گناہوں کی پاداش میں پراسچت کرنے کیلئے پٹھان کی بیوی بنا دیا گیا ہو۔ جب کبھی میں بانو کے گھر جاتا ہوں تو ڈرائینگ روم میں کھانے کے کمرے میں، خوابگاہ میں باورچی خانے میں ہر جگہ سکرپٹوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔

یہ صوفہ ڈیڑھ سکرپٹ دے کر خریدا تھا۔ وہ فرج دس سکرپٹوں میں آیا تھا۔ یہ والا ٹیپ ریکارڈ دراصل پندرہ سکرپٹ ہیں۔ یہ استری، چھاپہ مشین ٹائپ رائیٹر، موٹر کار، مرغ روسٹ کرنے والا اوون، ملک شیکر، یہ سب سکرپٹ ہیں۔ بانو کے لکھے ہوئے سکرپٹ، اشفاق کے لکھے ہوئے سکرپٹ۔ ان کے باورچی کی تنخواہ چوتھائی سکرپٹ ہے۔ بچوں کی فیسیں ایک سکرپٹ ہیں۔ موٹر کار کی قسط دو سکرپٹ ہیں۔ ان کے گھر کا تمام تر ماہوار خرچ تین سکرپٹ ہیں۔ یہاں تک کہ پٹھان بچوں کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون بھی سکرپٹوں سے کشید کیا

گیا ہے۔

جب بانو اشفاق کی شادی ہوئی تھی تو انہوں نے ایک چار دیواری کرائے پر لے لی تھی اور ایک رم کاغذ کی سلپیں کٹوا کر ایک گرز پنسلیں خرید کر یہ دونوں سکرپٹ رائٹر بیٹھ گئے تھے۔ اشفاق صرف سکرپٹ رائٹر تھا، بانو سکرپٹ لکھنے کے علاوہ باورچن، دھوبن اور پتی رکشن تھی۔ ابھی بیاہ کو دو دن ہوئے تھے کہ انہیں محسوس ہوا کہ گھر چلانے کیلئے صرف محبت کا جذبہ کافی نہیں۔ اشفاق نے کان پر پنسل اٹکائی، ہاتھ میں سلپیں لیں اور باہر نکل کر سکرپٹ لکھوا لو، سکرپٹ کی صدا لگانی شروع کر دی۔ گھر میں دلہن سنگار کرنے کی بجائے ڈھیر سی سلپیں کاٹ کر اور پنسلیں بنا کر بیٹھ گئی کہ نہ جانے کس وقت آرڈر آ جائے۔ اتفاق سے اشفاق کو ایک پٹھان پبلشر مل گیا۔ اس نے کہا بھائی کیوں خوار ہوتا ہے ہم سے گزارہ کیلئے پیسے لو اور فرنٹیئر کے مدرسوں کیلئے نصابی کتابیں لکھو۔ پھر جب وہ منظور ہو جائیں گی تو رائلٹی کے پیسے سے موج کرنا۔ اشفاق اور بانو دولہا دلہن کا رول بالائے طاق رکھ کر کئی ایک دن مشیانہ کام میں مصروف رہے۔ بدقسمتی سے کتابیں منظور نہ ہوئیں۔ بہر حال ہفتہ دس دن کا گزارہ ہو گیا۔ اس کے چند سال بعد اشفاق پشاور گیا تو اتفاق سے اس نے ایک دوکان پر وہی کتابیں چھپی ہوئی دیکھیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اگرچہ وہ فرنٹیئر میں منظور نہیں ہوئی تھیں لیکن آزاد کشمیر میں انہیں منظور کر لیا گیا تھا۔ اشفاق اپنے پرانے محسن پبلشر سے ملا تو وہ بولا،

"خو عقل کی بات کر بھائی وہ رائلٹی کی بات تو صرف فرنٹیئر کیلئے تھی کسی اور جگہ کیلئے نہیں تھی"۔

اشفاق، قدسیہ پاکستان کے اولین اور واحد سکرپٹ رائٹر ہیں جن کا اوڑھنا اور بچھونا صرف سکرپٹس ہیں۔ بانو اشفاق کے دوستوں اور مداحوں نے کئی بار ان سے کہا کہ یہ سکرپٹ بازی چھوڑو اور نوکری کر لو، لیکن دونوں نے ہی انکار کر دیا۔ قدسیہ تو نوکری کے حق میں نہیں۔ اشفاق اس سے خائف ہے۔

دس سال کی مسلسل محنت کے بعد انہوں نے سکرپٹوں کے بل بوتے پر ایک گھر بنا

لیا۔ ایک ایسا گھر جو چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ سجا ہوا نہیں۔ سجانے کی کئی ایک بار کوشش کی اور پھر متفقہ فیصلہ ہوا کہ چھوڑو۔

شیخ چلی کی کٹیا کی صفوں سے بنی ہوئی چھت بالکل بوسیدہ ہو کر جگہ جگہ سے ٹپکنے لگی۔ شیخ نے اسے قائم رکھنے کیلئے جگہ جگہ بانس کے تھم لگا دیئے۔ یہ تھمیاں تعداد میں اتنی زیادہ ہو گئیں کہ جھونپڑی کے اندر جانے یا بیٹھنے کی جگہ نہ رہی۔ ایک روز جب بارش ہو رہی تھی اور شیخ کٹیا سے باہر بیٹھے بھیگ رہے تھے تو ایک راہ گیر نے کہا شیخ جی آپ کٹیا کے اندر کیوں نہیں جا بیٹھتے۔ شیخ نے جواب دیا بھائی اگر اندر بیٹھنے کی جگہ ہوتی تو دو تھمیاں اور نہ لگا دیتے۔

بانو کے گھر میں اگر جگہ ہوتی تو وہ چند سکرپٹ لکھ کر اشفاق کے دل بہلاوے کیلئے دو چار مزید گیجٹ نہ منگوا دیتی۔

اشفاق احمد تلقین شاہ کے پُر وقار چغے کے باوجود ایک معصوم بچہ ہے۔ زندگی میں اس کے صرف دو کام ہیں۔ سکرپٹ لکھتا ہے اور گیجٹوں اور مشینوں سے کھیلتا ہے یہ اس کے گلدان ہیں۔

پتی بھگتنیں جانتی ہیں کہ کام گھر سے بے تعلق کرتا ہے۔ کھیل گھر کی طرف کھینچتا ہے۔ بانو نے کبھی اشفاق کو سنوارنے کی کوشش نہیں کی وہ ہر وقت اسے بگاڑنے کی دھن میں لگی رہتی ہے۔ اس کے گرد گلدانوں کی بھیڑ لگا دیتی ہے۔ گلیکسو بے بی خوش ہے کہ وہاں ڈالڈا بھی ہے اور ماما بھی۔ کتنی معصومیت ہے اشفاق میں۔

اپنی بے کراں معصومیت کی وجہ سے اشفاق سکرپٹوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ بانو نے سکرپٹوں کو ہی چپو بنا لیا اور اس بحر مشیانہ کو پار کر کے اہل کرم اک تیرے آنے سے اور دھواں سے ہوتی ہوئی وہ شہر بے مثال تک آ پہنچی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ وہ جلد ہی شہر لازوال میں داخل ہو جائے گی۔

"ایک معاملے میں اشفاق بے حد سیانا ہے اس نے بانو قدسیہ کی شہر بے مثال نہیں پڑھی۔ وہ اسے کبھی نہیں پڑھے گا۔ ہمیشہ گڈریے کا سونٹا تھامے تلقین شاہ کا چغہ پہنے گلدان

اٹھائے گھر میں گھومتے ہوئے کہتا رہے گا۔" قدسیہ فرصت ملی تو میں تمہاری شہرِ بے مثال ضرور پڑھوں گا"۔

شہرِ بے مثال پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ کاش میں یہ کتاب نہ پڑھتا لیکن اب سوائے اس کے کیا کیا جا سکتا ہے کہ میں آپ سے دست بستہ عرض کروں کہ للہ شہر بے مثال نہ پڑھیئے۔ آپ نہیں جانتے اگر پھر سے جینے کی آرزو انگڑائیاں لینے لگے تو کتنی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب

پائنسز کی حیثیت سے

قدرت اللہ شہاب کی شخصیت بیک وقت سادہ بھی ہے اور پرکار بھی۔ اسے مغلوں کی مشہور عمارت ایوان عام سے تشبیع دی جا سکتی ہے۔ جس میں سادگی ہے، حُسن ہے، وسعت ہے لیکن محرابوں کے پرکار تسلسل کی وجہ سے کئی ایک سمتیں پیدا ہو گئیں ہیں۔

سب سے پہلے آپ قدرت اللہ کے عجز کو محسوس کرتے ہیں۔ اس کی سادگی خلوص اور ہمدردی آپ پر خوشگوار اثر چھوڑتی ہے اور آپ سوچتے ہیں کتنا اچھا آدمی ہے۔ مزید قرب کا موقعہ ملے تو اس کا گونگا پن کھلنے لگتا ہے. جی چاہتا ہے کہ اس سے گہرا ربط پیدا ہو۔ مزید قرب پیدا ہو۔ لیکن بات نہیں بنتی۔ آپ پھر کوشش کرتے ہیں بے سود قدرت میں ایک پراسرار اور پریشان کن بھید محسوس ہوتا ہے۔ یا اللہ یہ کیا شخصیت ہے۔ دروازے چوپٹ کھلے ہیں لیکن اندر داخل ہونا مشکل ہے۔

قدرت اللہ قریب نہیں آتا۔ وہ قریب آنے نہیں دیتا۔ یہ اس کے کردار کی تیسری سمت ہے، جس کی مزید جھلکیاں دیکھ کر آپ گھبرا جاتے ہیں۔ بالآخر جب آپ کو علم ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت کی ایک چوتھی سمت بھی ہے اور وہ شخصیت کی گہرائی سے بھی عظیم تر ہے تو قدرت اللہ آپ کے روبرو ایک اجنبی بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

مجھے شک ہے کہ قدرت اللہ بسا اوقات اپنے روبرو اجنبی بنا کھڑا ہوتا ہے۔

شہاب کی شخصیت کو پیاز سے تشبیع دی جا سکتی ہے۔ اس میں چھلکے ہی چھلکے ہیں،

پردے ہی پردے ہیں۔ پردہ در پردہ، ان گنت پردے۔ ہر پردے کی جھال انوکھی ہے۔ ہر پردے کا رنگ نیا ہے۔ رنگا رنگ پردے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں پیاز کی سی بو نہیں۔ تلخی نہیں، لیکن خبردار ان پردوں کو کھولئے نہیں ورنہ آپ اشکبار ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے فلکیاتی شخصیت pisces کا سہارا لیا ہے۔ اور بلا واسطہ قدرت اللہ کی شخصیت کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ قدرت اللہ میں میری دلچسپی علم النجوم کی وجہ سے ہوئی یا علم النجوم سے میری دلچسپی قدرت اللہ کی وجہ سے ہوئی۔ بہر صورت یہ دونوں باتیں بیک وقت عمل میں آئیں۔

اتفاقیہ طور پر میں نے کیرو کی وہ کتاب پڑھی جس میں فلکیات کے مطابق شخصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلی شخصیت جس کا میں نے مطالعہ کیا pisces کی تھی اتفاقاً مجھے معلوم ہوا کہ تاریخ پیدائش کے لحاظ سے شہاب piscean ہے۔ میرے سامنے ایک جیتا جاگتا pis-cean کھڑا تھا۔ ایک مثبت اور منور piscean جیسے sun piscean کہا جاتا ہے۔

فلکیات کی رو سے شخصیتیں آگ پانی اور ہوا کے خواص لئے ہوتی ہیں۔ pis ceans میں پانی کا عنصر حاوی ہے۔ دیکھ لیجئے قدرت میں پانی کی سی نرم مزاجی ہے۔ پانی کا سا بہاؤ ہے۔ جذبات کی لہریں ہیں اتنی رواداری ہے کہ چاہے اسے مشکیزے میں بھر کر چھڑکاؤ کر لیجئے چاہے صراحی میں ڈال کر جام بھر لیجئے چاہے کوزے میں ڈال کر وضو کر لیجئے۔ اسے کسی سانچے میں ڈھال لیجئے۔ ڈھل جائے گا۔ صرف آپ کی خاطر۔ آپ کوئی بھی ہوں کیسے بھی ہوں۔ رواداری کے خیال سے "دل بدست آور" کے خیال سے حج اکبر کے خیال سے نہیں۔ لیکن آپ کے لئے ڈھل جانے کے باوجود اس کے ذاتی اوصاف ذاتی کردار میں فرق نہیں آئے گا۔ اس کا کردار اٹل ہے۔ pisces کو مین راس کہتے ہیں۔ اس کا برج حوت ہے۔ اس کا ستارہ مشتری ہے۔

جانے کیوں قدرت اللہ کے قریب رہ کر ستاروں سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے شاید اس لئے کہ نصف کے لحاظ سے وہ خود بھی ایک تارہ ہے۔ ایک تن تنہا اکیلا تارا۔ جو بے حدود

ہے۔ جسے کسی سے بھی constilation سے تعلق نہیں۔ جس کی روشنی بے حد مدھم ہے۔ جو جگنو کی طرح ٹمٹماتا ہے، چمکتا ہے، گل ہوتا ہے، جو چمکنے سے شرماتا ہے۔ جسے گل ہونے سے زیادہ دلچسپی ہے لیکن تقدیر نے بھرپور چمکنا عائد کر کے ایک قیامت برپا کر رکھی ہے۔

pisces کا نشان مچھلیاں ہیں دو مچھلیاں جن کی دمیں آپس میں بندھی ہوئی ہیں اور وہ متضاد سمتوں میں تیرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ قدرت اللہ کے قریب جاؤ تو پتہ چلے ان متضاد سمت میں تیرنے والی بندھی ہوئی مچھلیوں نے کیا ہلڑ مچا رکھا ہے۔ لیکن قریب جانے کا سوال پیدا بھی ہو۔ اس نے کبھی کسی کو اس قدر قریب آنے نہیں دیا کہ اس کے دل کا دکھ دیکھ سکے۔ وہ دوستوں کو خوشیوں میں شریک کرنے کے لئے بے تاب ہے لیکن دل کے دکھ کو یوں چھپائے پھرتا ہے جیسے چاند اپنی دوسری سمت کو۔

دور سے قدرت اللہ کی طرف دیکھئے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مہاتما بدھ آنکھیں بند کئے بڑ کے درخت تلے بیٹھا ہو یا جیسے بے حسی سے مالا مال ہو کر کوئی شخص ابدی سکون حاصل کر چکا ہو۔ یا جیسے کنول کا پھول ہو جھیل پر تیر رہا ہو۔ یا جیسے گونگا پہلوان ہو جسے نہ ذہنی چمک سے واسطہ ہو نہ احساس کی دولت سے تعلق ہو۔ جسے مگدر پھیرنے اور زور کرنے کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہ ہو۔

اس کے چہرے اور انداز کو دیکھ کر کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ ایک طوفان دبائے بیٹھا ہے۔ ظاہری بے حسی جمود یا نروان کے تلے احساسات کی شدت چھریاں چلا رہی ہے اور جذبات کی دم بندھی مچھلیاں متضاد سمتوں میں تیرنے کے خبط میں اودھم مچائے ہوئے ہیں۔

ایک مشہور "منجم کتینہ تھیوڈو سیلو" کا کہنا ہے کہ piscean شخصیت کے دو پایہ ستون ہیں۔ گہرائی اور اسرار۔ قدرت اللہ کی گہرائی میں ایک نظر جھانکنا تو شاید ممکن ہو مگر اسے پانا ممکن نہیں اور اس میں داخل ہونا قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گہرائی تیسری dimension میں نہیں بلکہ چوتھی dimension میں ہے۔ اور ہم پر اس کے دروازے بند ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس کا دل اور روح دو بڑے آئینے ہیں جو ایک دوسرے

کے مقابل رکھے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان قدرت کی شخصیت کا مٹی کا دیا ٹمٹما رہا ہے۔ آئینوں میں دیئے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ قطار اندر قطار، نہ ختم ہونے والی قطار، گہرائی ہی گہرائی، اتھاہ گہرائی۔ میں نے قدرت اللہ کی گہرائی میں جھانکا ضرور ہے لیکن اسے پا نہیں سکا۔ البتہ اس کے اسرار سے محظوظ ہوا ہوں۔ اور متاثر بھی۔ piscean شخصیت کی وضاحت کرتے ہوئے Lyndoe کہتا ہے۔ pisceau میں سمندر کی سی گہرائی ہے۔ زندگی اس کے لئے اک راز ہے اور اس راز کو سینے سے لگائے رکھنا اس کے لئے زندگی ہے۔ پردے سے اسے عشق ہے، پردہ پوشی کا متوالہ۔ افشائے پردہ کا دشمن۔ piscean اپنے عزیز ترین دوست سے روبرو بھی اپنی زندگی اور شخصیت کے کچھ دروازے کھولنے سے گریز کرے گا۔

یہ میرے الفاظ نہیں بلکہ لنڈو کے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے ہر منجم کے ہیں۔ سچ پوچھے تو یہ مقالہ میرا نہیں۔ اس میں کوئی بات بھی تو میری نہیں۔ یہ ایک مثبت اور منور شخصیت کا بیان ہے جسے بیسیوں منجم اپنے اپنے رنگ میں پیش کر چکے ہیں۔

قدرت اللہ کو پردے سے عشق ہے۔ والہانہ عشق۔ پردے سے اس کا کوئی مقصد وابستہ نہیں۔ خالی پردہ فن برائے فن قسم کا پردہ۔ پردہ قدرت اللہ کو اتنا ہی مرغوب ہے جتنے غالب کو آم تھے۔ آم ہوں، میٹھے ہوں، بسیار ہوں۔

پردے ہوں بے مقصد ہوں۔ بسیار ہوں۔

عام طور سے لوگ اپنی منفی خصوصیات پر شرماتے ہیں، انہیں چھپاتے ہیں۔ قدرت اللہ اپنی مثبت خصوصیات پر شرماتا ہے انہیں چھپاتا ہے۔

عام طور سے لوگ اپنی جھوٹی مثبت خصوصیات اچھالتے ہیں۔ قدرت اللہ اپنی منفی خصوصیات خود نہیں اچھالتا۔ لیکن اگر وہ اچھل جائیں تو خوش ہوتا ہے۔ گویا دوشیزہ کو ایک اور گھونگھٹ مل جاتا ہے۔ پیاز میں ایک چھلکے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

آپ قدرت اللہ سے ملیئے۔ ان منفی خصوصیات کا ذکر کیجئے جو اس کی شخصیت میں موجود نہیں۔ شرط یہ ہے بات میں تعریفی پہلو نہ نکلے۔ مثلاً اس سے کہیئے۔ یہودی کوئی تم سا

نہیں دیکھا۔ تحمل کی تم نے انتہا کر دی۔ اس کی آنکھ میں چمک لہرائے گی "ہے نا" وہ جواب دے گا۔

کہیے خود غرضی میں تمہارا جواب نہیں۔ وہ اس قدر خوش ہو گا کہ اپنا کام چھوڑ کر پورے طور پر آپ کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اور اگر یہ کہہ دیجئے کہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے فن میں تم بہت استاد ہو۔ تو شاید مانگ کیا مانگتا ہے کے شاہانہ موڈ میں آ کر وہ آپ کو چائے بھی پلا دے۔ لیکن اگر آپ نے اس کی سخاوت اس کے عجز اسکی عبادت یا اس کے خلوص کا تذکرہ چھیڑ دیا تو وہ ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ جائے گا۔ اپنے کوئے میں داخل ہو جائے گا۔ اور ایسا رویہ اختیار کرے گا کہ پلک جھپکنے میں آپ اس سے کوسوں دور ہو جائیں گے۔ اس کی خاموشی منوں بوجھل ہو جائے گی۔ اور یہ بوجھ آپ کے شانوں پر ڈھیر ہونے لگے گا۔ حتیٰ کہ آپ قدرت اللہ سے رخصت لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

پردہ قدرت اللہ کا زیور ہے۔ اس رعایت سے قدرت اللہ ایک دلہن ہے اس کا اظہار تکلم سے ناآشنا ہے۔، اس حد تک ناآشنا کہ اس نے کبھی پلا مار کر بھی دیا نہیں بجھایا۔ خاموشی اس کا واحد ساتھی ہے۔ وہ اس کی ڈھال بھی ہے جس سے وہ اپنا تحفظ بھی کرتا ہے۔ وہ اس کی تلوار بھی ہے۔ جس سے وہ وار کرتا ہے۔ میں نے اس کی خاموشی کے کئی روپ دیکھے ہیں۔ کبھی اسے بادِ نسیم کی طرح خنک اور خوشگوار دیکھا ہے اور کبھی وہ یخ برف کا تودہ بن جاتا ہے اور کبھی دھند کی دبیز تہہ۔ بسا اوقات قدرت کی خاموشی باتیں بھی کرتی ہے۔ زیرِ لبی میٹھی میٹھی باتیں جیسے ملاقات کے طالب سے چاندنی باتیں کرتی ہے۔ ایسی باتیں بھی کرتی ہے کہ آپ میں سننے کی اہلیت ہو تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ ایک جون آف آرک ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ندی بن کر گنگناتی بھی ہے۔ جسے سن کر آپ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی جینے کے قابل ہے۔ لیکن قدرت اللہ کی خاموشی میں یہ بھی طاقت ہے کہ وہ آپ کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے۔ بلکہ مجھے شک ہے کہ وہ ہلاک بھی کر سکتا ہے۔ قدرت اللہ کی خاموشی میں ایک انفرادیت ہے ایک واضح شخصیت۔

قدرت اللہ کی پردہ سے دلچسپی اپنی ذات تک محدود نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے کائنات سے صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ اس نے پردے اوڑھے ہوئے ہیں۔ اسے سچائی اس لئے پیاری ہے کہ وہ ہمیشہ ملفوف ہوتی ہے۔ لیکن اس بات کو میں آج تک نہیں پاسکا کہ آیا اسے اللہ تعالیٰ سے اس لئے پیار ہے کہ انہیں پردہ اور پردہ پوشی پسند ہے یا پردہ سے اس لئے محبت ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کو پسند ہے۔

قدرت اللہ کو ننگا پن پسند نہیں۔ اسے پردہ دری سے چڑ ہے۔ آپ اس سے کوئی اپنا راز بیان کرنے کی کوشش کر دیکھئے۔ آپ کا ارادہ بھانپ کر اس پر گھبراہٹ طاری ہو جائے گی۔ وہ کہے بغیر آپ کو اس حماقت سے باز رکھنے کے کئی ایک جتن کرے گا۔ دفعتاً اسے کوئی بھولا ہوا کام یاد آجائے گا۔ لیکن ساتھ ہی اسے گپ شپ سے بہت دلچسپی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس میں الزام تراشی کا پہلو نہ ہو۔ بے مقصد گپ کے دوران میں آپ اسے افواہ، سکینڈل بھی سنا سکتے ہیں۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنے گا۔ لیکن جونہی آپ رخصت ہوں گے۔ وہ پر جھاڑ کر پھر سے خشک ہو جائے گا۔ اور آپ کی باتیں ایک بے نام فرحت پیدا کرنے کے علاوہ اس پر کوئی اثر نہ چھوڑیں گی۔ اگر اتفاقاً یا ویسے ہی قدرت اللہ کو اس راز کا علم ہو جائے کہ آپ کا کردار داغدار ہے تو اس کے بعد وہ مسلسل طور پر اس کوشش میں لگا رہے گا کہ آپ کو یہ علم نہ ہو جائے کہ وہ آپ کا راز جانتا ہے، چونکہ کسی کے راز کو جاننا یا کریدنا شرافت نہیں۔ لہذا قدرت اللہ آپ کے سامنے یوں محسوس کرے گا جیسے وہ مجرم ہو۔ آپ سے نفرت کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ البتہ اسے آپ سے ہمدردی ہو جائے گی۔ چونکہ وہ محسوس کرے گا کہ آپ کا راز جان کر اس نے آپ سے زیادتی کی ہے اور اس خیال سے بھی وہ اسے چھپائے پھرے گا کہ اگر آپ کو علم ہو گیا کہ وہ آپ کی حقیقت سے واقف ہے تو آپ کو دکھ ہوگا۔ ---یا اس کی وجہ اور بھی ہو سکتی ہے۔

کیرو کا کہنا ہے کہ Piscean کو کیمیا فلاج سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر قدرت اللہ کا بس چلے تو وہ دنیا کی ہر چیز کو کیمیا فلاج کر دے۔

فلکی تجزیئے کے مطابق Piscean میں انسانی جذبہ نمایاں ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کی شدت کمزوری کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس میں ہمدردی کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ اس وقت عمل میں آتا ہے جب وہ ایسے لوگوں سے ملتا ہے جو حالات کی وجہ سے زندگی میں ابھر نہیں سکے۔ جن سے قسمت نے وفا نہیں کی۔ ایسے لوگ جو راہ مستقیم سے بھٹک گئے یا ایسے لوگ جو معذور ہو گئے۔

اسی وجہ سے Piscean ایسے Professions میں پائے جاتے ہیں جو خدمت خلق سے متعلق ہوتے ہیں۔ Piscean یا تو ڈاکٹر ہوگا یا اصلاحی کارکن یا پادری۔

بظاہر قدرت اللہ نہ تو ڈاکٹر ہے، نہ اصلاحی کارکن اور نہ پادری۔ لیکن ہمدردی اور خدمت کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اصولی طور پر ہمدردی کے جذبے کی شدت آپ کو مفلوج کر دیتی ہے۔ کوشش کے باوجود اگر آپ کسی مظلوم کی مدد نہ کر سکیں تو آپ کے دل کی گہرائیوں میں ایک تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک بے نام دکھ۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اگر قدرت اللہ کسی کی مدد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اسے اس پر دکھ محسوس نہیں ہوتا۔ اسے مظلوم سے بے پناہ ہمدردی ہے لیکن ظلم سے وہ بے پروا ہے اور ظالم کے خلاف نہ وہ غصہ محسوس کرتا ہے نہ نفرت۔ یہی وجہ ہے کہ مظلوم کو دیکھ کر اس کے دل میں ظلم کے خلاف تلخی پیدا نہیں ہوتی۔ مظلوم کو دیکھ کر وہ اس کی مدد کرنے کیلئے کمر باندھ لے گا۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے تو بھی اس میں دکھ پیدا نہ ہوگا۔ "کیا کیا جائے" کہہ کر وہ نہایت اطمینان سے اپنے کام میں منہمک ہو جائے گا۔

Pisecan کے ساتھ رہنا پڑے تو صبر و تحمل کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے چونکہ کتینہ کا کہنا ہے کہ Piscean کے موڈ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا شوق ربڑ کے گیند کی طرح گرتا اچھلتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں مدوجزر کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھتی رہتی ہیں اور احساسات کی شدت اس میں انوکھی پھرکیاں چلاتی رہتی ہے۔

شہاب کے موڈ بدلتے دکھائی نہیں دیتے اس کے شوق کا گیند نہ گرتا ہے نہ اچھلتا

ہے۔ اس کے دل میں جو پھر کیاں چلتی ہیں نہ وہ آواز پیدا کرتی ہیں نہ نظر آتی ہیں۔

صرف اس کی خاموشی کے بدلتے رنگ محسوس کر کے پتہ چلتا ہے کہ کوئی بات ہے۔ کبھی اس کی خاموشی لطیف ہوتی ہے اور کبھی بوجھل۔ کبھی وہ رنگین ہوتی ہے اور کبھی بے رنگ۔ اسے جانچنے کیلئے بات کیجئے۔ اگر آپ کی بات ٹن سے گرے تو سمجھ لیجئے کہ موڈ اچھا ہے اور اگر وہ پتھر کی سی آواز پیدا کرے تو اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ ہر صورت میں قدرت اللہ پوری توجہ سے آپ کی بات سنے گا اور اس کے ماتھے پر بل نہیں آئے گا۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے صبر و تحمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک اس کے صبر و تحمل کا سوال ہے کئی بار مجھے شک پڑتا ہے کہ اس میں صبر و تحمل کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ نہ جانے اسے صبر و تحمل پر غصہ کیوں آنے لگتا ہے۔

قدرت اللہ میں جھجک یوں کافور ہو جاتی ہے جیسے کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ یوں گھل مل جاتا ہے جیسے وہ اس کا ہمیشہ سے منتظر رہا ہو۔ بہر صورت جھجک اور شرمیلا پن اس کے کردار میں یوں رچے بسے ہیں جیسے ڈتول میں بو اور وہ انہیں چھپا نہیں سکتا۔ وہ قدرت کی شخصیت کی سرزمین پر نیلے آسمان کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن جھجک کے اس نیلے آسمان پر جرات اور دلیری کے ان گنت تارے چمکتے ہیں۔ اس کی جراتیں دیکھتا ہوں تو مجھے اس کی جھجک پر حیرت ہوتی ہے۔ جھجک دیکھتا ہوں تو جراتوں پر حیران ہوتا ہوں۔ اس کی جراتیں بچے داؤکی یاد دلاتی ہیں۔ اس کی جھجک شوہر خاوند کی سی ہے۔

ایک طرف تو وہ دفتر میں ہر سائل سے ملنے سے گھبراتا ہے۔ ٹالنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسری طرف کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بے دھڑک مگر سنجیدگی سے سائلہ سے کہہ دیتا ہے۔ محترمہ یہ فرمائیے کہ یہاں آنے سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ یہ سچ سچ کیا سائل کی شایان شان ہے یا ایک منجم سے بے دریغ کہہ دے گا، لوگوں سے روپے بٹورنے کا یہ دھندا جو آپ نے شروع کر رکھا ہے اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے آپ کو۔

اس کی جراتیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ایک بے نام Will Power ہے۔ ایک زبردست Hypnotic اثر ہے۔ آیا اسے اپنی ان طاقتوں کا شعور ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق میں نہیں جان سکا۔ البتہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے ان طاقتوں کو التزاماً کبھی استعمال نہیں کیا۔ اکثر وہ ضمنی طور پر استعمال ہو جاتی ہیں۔

آپ آئے، آپ کو دیکھ کر اس کے دل میں سرسری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ آپ فلاں موضوع پر بات نہ کریں۔ اب آپ چاہے گھنٹہ بھر اس کے پاس بیٹھے رہیں۔ وہ موضوع چاہے بار بار آپ کی زبان پر آنا چاہے آپ کی نس نس اس ان کہی بات سے بھری رہے۔ لیکن نہ جانے کس غیر مرئی طاقت کے زیر اثر آپ کی زبان پر تالا پڑا رہے گا۔ آپ ادھر ادھر کی باتیں کریں گے اور مقصد کی بات کئے بغیر رخصت ہو جائیں گے اور قدرت آپ کی ذہنی کشمکش دیکھ کر محظوظ ہوتا رہے گا۔

اگر اس نے آپ کو دیکھ کر فیصلہ کر لیا ہے کہ دو منٹ سے زیادہ آپ سے بات نہیں کرے گا تو چاہے آپ کوئی بھی ہوں، اعلیٰ افسر ہوں، قلاش سائل ہوں، باتونی خاتون ہوں یا اس کے بے تکلف دوست ہوں آپ دو منٹ سے زیادہ اس کے ساتھ نہیں بیٹھ سکیں گے۔ آپ پر چاروں طرف سے ایک بے نام پراسرار بوجھ پڑ جائے گا۔ ایک وحشت سی گھیر لے گی اور آپ کا جی چاہے گا کہ بھاگ لیں۔

شرمانے کے متعلق بھی اس کے کوائف بے حد انوکھے ہیں۔ اس کا چہرہ بالکل نہیں شرماتا۔ شرمائے بھی تو شرماتا دکھتا نہیں۔ شاید اس پر رنگ آتا جاتا ہو مگر نہ آتا دکھتا ہے نہ جاتا۔ اس کے انداز سے شرمانے کی کوئی تفصیل ظاہر نہیں ہوتی اس کے باوجود نہ جانے کیسے ہر کوئی محسوس کر لیتا ہے کہ وہ شرما رہا ہے۔

پچھلے سال قدرت اللہ کے گھر اللہ نے فرزند عطا کیا۔ اس پر وہ اس قدر شرمایا کہ شک پڑنے لگا جیسے وہ باپ نہیں بلکہ بچے کی ماں ہو جس کی شادی اعلانیہ نہیں بلکہ خفیہ طور پر ہوئی ہو۔ اس نے بچے کی پیدائش کی خبر اپنے منہ سے کسی کو نہ سنائی۔ پھر جب لوگوں کو جیسے

کیسے علم ہو گیا اور وہ مبارکباد کیلئے آنے لگے تو اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور وہ محفل میں یوں بیٹھا رہتا جیسے نین ابجر دولہا ہو۔

اگر قدرت آپ پر احسان کر دے تو آپ سے شرمانے لگے گا جیسے احسان نہ ہوا گناہ ہوا۔ آپ کے روبرو اول تو سخاوت کا کوئی کام کرے گا ہی نہیں۔ اور اگر سرزد ہو جائے تو آپ سے شرمانے لگے گا۔ اپنی تعریف سن کر وہ شرمائے گا۔

اگر آپ اس کے دل اور روحانی اوصاف کا تذکرہ کریں تو "شرماہٹ" کی بجائے اس میں گھبراہٹ پیدا ہوگی اور وہ چاہے گا کہ یہ بات چھوڑ کر کوئی اور بات شروع ہو۔ لیکن -- اگر آپ اس کی ذہنی قابلیت کی بات چھیڑ دیں تو بظاہر وہ یوں بیٹھا رہے گا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ اس کے پاس خوشی، دوستی، قرب کا اظہار کیا ہے صرف ایک ادھوری مسکراہٹ جو آتی ہے چلی جاتی ہے۔ مونالیزا کی سی نیم مسکراہٹ، آنکھ میں ایک لہر جو کوندتی ہے ختم ہو جاتی ہے۔ اظہار کے معاملے میں وہ بے حد بخیل ہے۔ لیکن وہ بے حد سخی اور مخیّر ہے۔

قدرت کے والد بزرگوار عبداللہ صاحب کے انتقال کے بعد بیس ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص ان کے گھر آئے اور انہوں نے فرداً فرداً اہل خانہ پر اس راز کا انکشاف کیا کہ انہوں نے عبداللہ صاحب کے وظیفے پر تحصیل علم کیا تھا۔

قدرت اللہ شہاب کے جیتے جی اس کے قریبی رشتے دار بھی اس راز سے واقف نہیں ہو سکتے کہ کتنے اور کون کون سے لوگ اس کے وظیفے پر زندگی گزار رہے ہیں یا تحصیل علم کر رہے ہیں۔ ایسے منی آرڈر بھیجنے کیلئے وہ چپڑاسیوں کی خدمات حاصل کرنے سے بھی گریز کرتا ہے۔

دو ایک منی آرڈر حوالہ ڈاک کرنے کیلئے مجھے بھیجا گیا۔ شاید میں انہیں اہمیت نہ دیتا۔ لیکن اس کا تفصیل سے مجھے سمجھانا کہ یہ رقم میں نے اس شخص سے قرض لی تھی اور اس کی ادائیگی میں اتنی دیر ہو گئی ہے کہ اب بھیجتے ہوئے شرم آتی ہے۔

کئی سال ہوئے ایک سفید پوش دوست نے تین ہزار روپے قدرت کے پاس امانت رکھے تھے اور کہا تھا جب جتنے روپے کی ضرورت ہو گی منگالوں گا۔ ختم ہو جائیں تو بتا دینا۔ آج تک وہ صاحب جب جتنے کی ضرورت ہوتی ہے منگا لیتے ہیں۔ تقاضے کے باوجود قدرت اللہ انہیں حساب اس لئے نہیں بھیجتا کہ اسے علم نہ ہو کہ وہ جمع کردہ رقم سے کئی گنا روپیہ زیادہ وصول کر چکے ہیں۔

قدرت کی والدہ ماجدہ کے انتقال پر ایک اندھا حافظ قرآن اسے ملنے آیا۔ میں نے پوچھا۔ جی آپ کس لئے آئے ہیں؟ بولا، فاتحہ کہنے آیا ہوں۔ میں نے پوچھا کہاں سے آئے ہیں۔ جواب دیا سیالکوٹ سے۔ میں نے پوچھا کسی اور کام سے آئے ہوں گے۔ بولا، جی نہیں صرف فاتحہ کیلئے۔ میں نے کہا آپ انہیں جانتے ہیں۔ بولا جی نہیں۔ کبھی ملے ہیں۔ جی نہیں۔ آپ ہیں کون؟ میں نے پوچھا۔ بولا جی وہ مجھے ماہوار خرچہ بھیجتے ہیں۔ میں نے پوچھا تو آپ ان سے ملیں گے۔ بولا جی میں تو صرف فاتحہ پڑھنے آیا ہوں۔

کاش کہ اس وقت قدرت اللہ موجود ہوتا۔ اندھے کی بات سن کر وہ پانی پانی ہو جاتا اور میں صراحی میں ڈال کر ایک جام بھر لیتا۔

میرا جی چاہتا ہے کہ لوگوں سے کہوں۔ قدرت سے جو جی چاہے مانگئے لیکن خدارا اسے سفارش کرنے کیلئے نہ کہیئے۔ میں نے اسے فون پر سفارش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ رومن دور کے گیلی سلیوز Slaves کو فلم میں دیکھ کر مجھے مظلومیت کا اس شدت سے احساس نہیں ہوا تھا۔ قدرت دے سکتا ہے مانگ نہیں سکتا۔

اسی وجہ سے وہ ایک سچا مگر انوکھا عاشق ہے جسے محبوب کی بجائے عشق سے لگاؤ ہے۔ وہ ایک ایسا فرہاد ہے جسے شیریں کی نسبت پہاڑ کھودنے سے زیادہ دلچسپی ہے۔ ایک ایسا مجنون ہے جسے جنوں کو دل کی گہرائیوں میں جذب کر لینے کا سودا ہے جو وصل سے خائف ہے لیکن قرب کا متوالہ ہے۔ جس کی تمام تر لذت سہنے اور پی جانے میں ہے۔ کرنے میں نہیں۔ کبھی کبھار مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک حبشی ہے جو اپنی خواہش کا کوڑا

بنا کر اپنے آپ کو پیٹتا ہے۔ حتیٰ کہ خواہش کی تپتی ہوئی شدت کی انتہا پر پہنچ کر روشنی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ روشنی اپنے منبے کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک خود غرض عاشق ہے جو عشق کی چنگاریاں صرف اس لئے اڑاتا ہے تاکہ اپنے لئے نورانی مدارج حاصل کر سکے۔

لیکن وہ ایک ایسا یوگی بھی ہے جو تیاگ کا قائل نہیں۔ اس کا مقصد چھوڑ کر پانا نہیں بلکہ پا کر چھوڑ دینا ہے۔

اس لحاظ سے وہ ایک انوکھا محبوب بھی ہوا۔ وہ آپ کی توجہ کو اپنے آپ پر مرکوز ہونے دیگا اور پھر چپکے سے درمیان میں سے ہٹ جائے گا اور آپ کسی ارض مقدس میں کھڑے ہوں گے اور کسی منور جالی کے پروانے بنے ہوں گے۔

کیرو کے جائزے کے مطابق Piscean گرے ہوؤں کو اٹھانے اور بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے کیلئے بے تاب ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں قدرت اللہ کا طریق کار دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی Communication کمپنی کا ملازم ہو اور ایک ویران سٹیشن پر اس لئے متعین ہو کہ اردگرد کے علاقے سے بھولے بھٹکے مسافروں کو تلاش کرے اور پھر ان جانے میں انہیں اس بس پر بٹھا دے جو منزل مقصود کو لے جاتی ہے۔

منجموں کا کہنا ہے کہ Pisceans شدت تاثر سے یوں بھیگے رہتے ہیں جیسے نور کے تڑکے پھول شبنم سے بھیگے ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں چمک ہوتی ہے، تخیل میں وسعت۔

قدرت اللہ کو بات سوجھتی ہے۔ اس کے تخیل میں جرات پرواز ہے۔ اسے بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے بشرطیکہ بات منہ زبانی نہ ہو۔ نہ ہم اسے ناول نگار کہہ سکتے ہیں۔ نہ افسانہ نویس، نہ شاعر کیونکہ وہ ایک خالص رائٹر ہے۔ کوئی چیز بھی ہو۔ تقریر ہو، سٹیٹ منٹ ہو۔ افسانہ ہو۔ انشائے لطیف ہو، یا آپ بیتی ہو، ہر صنف میں اس کی انفرادیت رنگ پیدا کرتی ہے اور قاری کو ایک مخصوص تاثر سے بھگو دیتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ وہ طنز نگار ہے۔ مزاح نگار ہے۔ میں نے اس کی لکھی ہوئی ایسی چیزیں بھی دیکھی ہیں جن میں نہ طنز ہے نہ مزاح۔ جن میں خلوص ہے سادگی ہے، آنسو ہیں، بد قسمتی سے اس کی بیشتر تصنیفات ادھوری رہ جاتی ہیں۔ جو شاید کبھی مکمل ہو کر سامنے نہ آئیں۔ اسی وجہ سے قاری آج تک اس کی گوناگوں رنگینیوں سے واقف نہیں ہو سکا۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ قدرت نے قدرت اللہ کے ہاتھ میں قلم اس لئے دے رکھا ہے کہ وہ اسے کسی آنے والے جہاد میں تلوار کے طور پر استعمال کرے۔

آخر میں مجھے اجازت دیجئے کہ میں Piscean شخصیت کی چوتھی Dimension کے متعلق کتینہ تھیوڈوسیو کا اصل بیان پیش کروں۔ کیونکہ میں اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔

کتینہ تھیوڈوسیو لکھتی ہیں:

There is a divine discontent which prives pisceans on
to seek the intangible an animal that lifts its muzzle to catch an
elusive secnt bome on the wild. A pisceans is conscious of
some essence, some meaning, purpose, experience too re-
fined too elusive to make impact on their zodiacal brothern.

یہ خصوصیت ایک عام Piscean کی ہے۔ نسبتۃً منور Piscean پر لاگو کرنے کیلئے اسے سوگنا کر لیجئے۔ ممکن ہے آپ میں اہلیت ہو۔ آپ کے ذہن میں واضح اور سالم تصویر کھنچ جائے۔ میرا ذہن تو دھندلا جاتا ہے۔ دھندلے نقوش تیرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا قدرت اللہ سے اک ان جانا بندھن ہے۔

قدرت اللہ میں مینڈک کی وہ حس موجود ہے جس کے تحت اسے ہونے والی بارش کا پتہ چل جاتا ہے۔ چڑیوں کی وہ حس موجود ہے جس کے تحت بھونچال آنے سے پہلے وہ اس علاقے سے اڑ جاتی ہیں۔ سمندری چیلوں کی وہ حس موجود ہے جس کی وجہ

سے طوفان آنے سے پہلے وہ بے تاب ہو کر فضا میں چکر کاٹتی ہیں۔ مرغ کی وہ حس موجود ہے جس کے تحت وہ نور کے تڑکے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس کی اس Sixth Sense کے مختلف پہلوؤں کا میں آج تک اندازہ نہیں لگا سکا۔

میراجی

پنجابی میں ایک مثل مشہور ہے "آٹا گندی دی ہلدی کیوں ایں"۔ اس بنا پر کہ آٹا گوندتے ہوئے ہلتی ہیں۔ کئی ایک گھر والیوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کئی ایک کو رد کر دیا جاتا ہے لیکن اسی بنا پر کئی ایک نہیں بلکہ ہر تخلیقی فنکار کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہر تخلیقی فنکار کو رد کر دیا جاتا ہے۔ تخلیق ادب کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ ادیب زندگی کے مناظر سے شدت سے اثر لے۔ اثر سے بھیگ جائے۔ اس قدر بھیگ جائے کہ چھینٹے اڑیں اور قاری کو بھگو دیں۔ خالی بھیگنے سے ہی چھینٹے نہیں اڑ سکتے۔ تخلیقی ادیب کو ہمہ تن سیال بننا پڑتا ہے۔ تاثر کے چھینٹے تو بے شک اڑتے ہیں۔ قاری بھیگتے ہیں، تخلیق پر واہ واہ ہوتی ہے، فنکار کو تحسین ملتی ہے، لیکن چھینٹے اڑانے والے ادیب کی اپنی شخصیت رقیق ہو کر بہہ جاتی ہے۔ اس میں ٹھوس پن نہیں رہتا۔ حدود نہیں رہتے۔ توازن نہیں رہتا۔ حس کی غیر از معمول شدت اسے کوڑے لگاتی ہے۔ ان کوڑوں تلے ادیب کی شخصیت ٹپتی ہے، ابھرتی ہے، سمٹتی ہے، بل کھاتی ہے، اور بالآخر انجانے انوکھے اور ممنوع نچانوں کی طرف بہہ جاتی ہے۔ اس پر لوگ فنکار کی شخصیت پر ہنستے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، تذلیل و تحقیر کے نشتر لگاتے ہیں۔

ایک طرف لوگ اس کی تخلیقات پر سر دھنتے ہیں اس کو ہیرو سمجھ کر پوجا کرتے ہیں دوسری جانب اس کی شخصیت کا مضحکہ اڑاتے ہیں ایک جانب عظیم تحسین دوسری طرف کاٹتی ہوئی تحقیر تخلیقی فنکاریوں ایک بے رحم دورخی کا شکار ہو جاتا ہے ایک ساعت میں وہ تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں بھی کچھ ہوں۔ اس کی انا میں پھونک بھر جاتی ہے میں

خالق ہوں۔ دوسری ساعت میں اس پھیلی ہوئی تحقیر اور احساسِ تذلیل کا کانٹا لگ جاتا ہے۔ ساری پھونک نکل جاتی ہے۔ انا کا فٹ بال پچک کر چھیچھڑا بن کر لٹک جاتا ہے۔ میں، میں تو کچھ بھی نہیں، پھر۔ چبھتی ہوئی تحقیر و تذلیل کے خلاف انتقام کا جذبہ ابھرتا ہے۔ فن کار اپنی شخصیت کو اور درہم برہم کر دیتا ہے۔ مزید انجانے نچانوں کی طرف بہا دیتا ہے۔ میں ایسا ہی ہوں کر لو میرا کیا کرنا ہے۔

میں نے میرا جی کے دونوں روپ دیکھے ہیں ہم کیا نہیں ہیں اور بھئی ہم تو کچھ بھی نہیں ہیں میرا جی کی پھولی ہوئی انا کا فٹ بال دیکھا ہے۔ میرا جی کی پچکی ہوئی میں کا چھیچھڑا دیکھا ہے۔ دورخی کے اس کوڑے تلے اس مظلوم حبشی کو بلبلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ شدت احساس کی دھنکی ہوئی تحقیر و تذلیل تلے میرا جی کی شخصیت کی پھپھوندی کو اڑتے دیکھا ہے۔ اور بالآخر اس چھائی ہوئی تحقیر و تذلیل کے خلاف میرا جی کے خوفناک انتقام کو دیکھا ہے۔ میرا جی نے انتقاماً خود اپنی شخصیت کے پرزے پرزے کر کے انہیں اڑا دیا، بکھیر دیا۔ غصے کے پیچھے سے اپنی ہی شخصیت کو انڈے کی طرح پھینٹ دیا التزاماً انجانے نچانوں انوکھی گھمن گھیریوں میں گھما دیا اور پھر میرا جی نے فاتحانہ انداز سے سر اٹھایا "ہم ایسے ہی ہیں، نہیں ایسے نہیں، اس سے بھی بدتر ہیں" "ہاں کر لو ہمارا کیا کرتے ہو۔

پہلے پہل کبھی کبھار ملاقات کے دور میں میرا جی میرے لئے ایک سلگتا ہوا پائپ کئی ایک بالوں کی لٹکیں اور چونکا دینے والی باتوں کا مرکب تھا، جس میں التزاماً چونکا دینے کا اہتمام نمایاں تھا۔ پھر ہمیں کچھ دیر کے لئے ایک جگہ ایک کمرے میں اکٹھے رہنے کا اتفاق ہوا۔

اس وقت میں نے میرا جی کو جانا۔

اس وقت میں نے تخلیقی فنکار کے المیہ کو سمجھا۔

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ what price glory

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ پنجابی کی اس عظیم مثل کا کیا مفہوم ہے۔

آٹا گندی دی ہلدی کیوں ایں۔

۱۹۳۹ میں پہلی مرتبہ میں نے میرا جی کو دیکھا۔

اس روز پہلی مرتبہ میں کسی اردو جریدے کے دفتر میں داخل ہوا تھا۔ اگر مولانا اصلاح الدین خطوں کے ذریعے ملاقات کے لئے اصرار نہ کرتے تو شاید ادبی دنیا کے دفتر میں داخل ہونے کی میں کبھی جسارت نہ کرتا۔

جھجکتے ہوئے میں دفتر میں داخل ہوا مجھے مولانا اصلاح الدین سے ملنا ہے۔ مولانا ابھی نہیں آئے چپڑاسی نے کہا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اچھا میں چلتا ہوں آپ انتظار کیجئے چپڑاسی نے کہا۔ نہیں نہیں۔ میں میں۔ میں پھر، پھر کبھی۔ کون صاحب ہیں ملحقہ کمرے سے ایک کراری آواز آئی۔ آپ میرا جی صاحب سے مل لیجئے۔ چپڑاسی نے مجھ سے کہا۔

نہیں نہیں مجھے صرف مولانا سے ہی۔ میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میرا جی کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ چست کپڑے پہنے ایک مستعد سا آدمی میرے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے کوئی کارندہ ہو یا کاروباری نائب۔

آپ کی تعریف۔ میرا جی نے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

میرا نام ممتاز مفتی ہے۔

میرا جی کے ہونٹوں پر ایک موہوم سا تبسم جھلکا۔ آیئے تشریف لایئے۔ بیٹھئے۔

نہیں نہیں میں از سر نو گھبرا گیا۔ میں میں پھر۔ پھر کبھی۔ مجھے صرف مولانا۔ صرف مولانا۔

میرا جی کے ہونٹوں کا تبسم اور واضح ہو گیا۔ اور واضح۔ حتیٰ کہ وہ کمرا اس تبسم سے بھر گیا اور میں بھاگا۔

سڑک پر پہنچ کر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میرا جی عجیب سا نام ہے میرا جی اور انتقاماً میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میرا جی۔

چند ایک ماہ کے بعد مجھے مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ چار ایک سرسری باتیں ہوئیں دوران گفتگو انہوں نے دو ایک بار میرا جی کو آواز دی۔ ملحقہ کمرے سے میرا جی کی آواز سنائی دی۔ وہی آواز، چست، مستعد کاٹتی ہوئی آواز۔

میراجی ؟از سرنو میں نے اس نام کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ شاید بنگالی ہے ہو گا۔ کوئی جنوبی ہند کا رہنے والا ہندو ہو گا۔ اور میں مطمئن ہو گیا۔

چند ایک ماہ کے بعد ازراہِ اتفاق ادبی دنیا کے ایک مقالے پر میری نظر پڑی "ڈی۔ ایچ۔ لارنس" کی شاعری۔ "ڈی۔ ایچ۔ لارنس" کی شاعری سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس لئے میں یہ نے مقالہ غور سے پڑھا۔ "معصوم دوشیزگی" کی نظم پڑھ کر میں گویا سکتے میں رہ گیا۔ اردو ترجمہ اصل سے بھی سبقت لے گیا تھا۔ شوق سے میں پڑھتا گیا۔ اس مقالے کے اختتام پر لکھا تھا۔ میراجی۔ میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں نے دوبارہ سہ بار اس نام کو پڑھا۔ وہ میراجی ہی تھا میراجی۔ وہ پتلا دبلا مستعد سا منشی میرے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اور میں حیرانی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ہونٹوں کا موہوم تبسم پھیلنے لگا۔ اور کائنات اس کی لپیٹ میں آ گئی۔

۱۹۴۰ء میں مجھے پھر ادبی دنیا کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آئیے، اندر سے میراجی کی آواز آئی۔ میں اندر داخل ہوا۔ میز کے پیچھے ایک بارعب چہرہ، شانوں پر گیسو، ہاتھ میں ایک بے ڈھنگا سا پائپ، ماتھے پر تیوری، بیٹھئے۔ اس کی آواز سن کر میں چونکا۔ وہی میراجی لیکن وہ مستعد جوان، وہ چست منشی، وہ متبسم جوان کیا ہوا۔ میں نے ایک بار پھر اس کا جائزہ لیا اور محسوس کیا جیسے ڈکنز کا کوئی کردار مشرقی روپ میں جلوہ گر ہو۔ کیا میراجی بہروپیہ ہے ؟ سراب ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ دو ایک ملاقاتوں کے بعد میراجی سے میری واقفیت ہو گئی۔ ایک روز میں نے پوچھا میراجی، آپ کا نام کیا ہے ؟ میراجی نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ "میراجی" اور پھر پائپ کے کش لینے لگا۔

نہیں، میں نے بات سمجھے بغیر کہا۔ آپ کا اصلی نام کیا ہے ؟

غالباً میرے سوال کی معصومیت نے اس کی قوتِ مزاحمت کو کمزور کر دیا تھا۔

ان جانے میں اس نے جواب دیا۔ اصلی نام ہمیں یاد نہیں رہا۔

میری ہنسی نکل گئی۔ میراجی کی پیشانی کی تیوری اور بھی چڑھ گئی۔ اس کی نگاہیں

خطرناک قسم کی سنجیدگی کی مظہر تھیں۔

تو اصلی نام کا حجاب ابھی تک قائم ہے میں نے پوچھا۔

کیوں، میراجی کی آواز نے مجھے دھمکایا۔

اس لئے کہ ابھی اصلی نام کو بھولنے کی خواہش باقی ہے۔ اصلی نام کے وجود کا احساس باقی ہے۔ اصلی نام کی یاد سے تلخی کا احساس ابھی وابستہ ہے۔ ایک لمحہ کے لئے میراجی کی تیوری اتر گئی۔ سنجیدگی سوچ بچار میں بدل گئی۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا اصلی نام ثناء اللہ ہے۔ ۔ ۔

لیکن پھر یہ بناوٹی نام۔ میراجی۔ اس زمانے میں میں می راجی کو میراجی کہا کرتا تھا۔ میراجی کا کیا مطلب یعنی میراجی۔ یعنی میری جگہ میراجی جی رہا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک ساعت کیلئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کہنے لگا۔ میراجی نہیں می راجی، میرا ایک بنگالی نام ہے۔ ہمیں میرا سے محبت ہے۔ اب ہم میرا ہیں اس کی یہ بات سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔ عجیب شخص ہے جو اپنی محبت کا قصہ ایک اجنبی سے یوں بیان کر رہا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اس زمانے میں میں سمجھتا تھا کہ محبت کرنا ایک جرم ہے۔ جس کے متعلق بات کرنا ممنوع ہے۔

عجیب آدمی ہے میں نے سوچا جو اپنی محبت کے راز کو یوں بیان کر رہا ہے جیسے وہ ایک پہاڑ ہو۔ جسے وہ دو دونی چار اے کی طرح سنا رہا ہے۔ اپنی محبت کو "میراجی" کے نام سے نشر کرنا۔ اپنے اصلی نام کو بھولنے کی شدید کوشش کرنا اور یوں جٹادھاری بن کر التزاماً عاشق کا روپ دھارنا کتنا تماشائی انداز ہے۔ کس قدر چھوٹا آدمی ہے یہ میراجی۔

مگر ڈی ایچ لارنس، مجھے خیال آیا اور دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے میرے روبرو بیٹھا ہوا وہ شخص بذاتِ خود معصوم دوشیزگی کا مجسمہ ہو جسے لارنس نے اس عظیم نظم میں پیش کیا تھا۔ دی ڈارک پلر چرننگ اون اٹس مس، وہ استادہ سیاہ ستون جو اپنے آتشیں وجود کے باوجود

بے بس تھا، محروم تھا۔

کتنا بڑا ہے یہ شخص میں نے سوچا۔ کتنا بڑا۔ آتشیں بے بس محروم اور میری نظر میں میراجی کا وہ بل کھاتا ہوا پائپ، وہ الجھے ہوئے گیسو، وہ دھمکیاں دیتی ہوئی سی آواز اور وہ چڑھی ہوئی تیوری، چھائی ہوئی بے بسی کو چھپانے کے پردے دکھائی دینے لگے۔

اور وہ استادہ سیاہ ستون اپنے آتشیں وجود کے باوجود بے بسی اور محرومیت کی وجہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"ہمیں میرا سے محبت ہے اس لئے ہم میراجی ہیں"۔ اس نے قہقہہ مار کر کہا۔

منٹو

ادیب کی گاڑی دو پہیوں پر چلتی ہے۔ ایک "میں تو کچھ بھی نہیں" دوسرا "میں بھی کچھ ہوں"۔ ایک بہت بڑا دوسرا بہت چھوٹا۔ ایک گول دوسرا چوکور۔

عوام کی گاڑی کے پہیے برابر ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں روانی ہوتی ہے۔ ادیب لڑکھڑاتا ہے ہچکولے کھاتا ہے۔

میں بھی کچھ ہوں اور میں تو کچھ بھی نہیں کی مدوجزر سے ادیب میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اس طوفان زدہ سمندر کو پاٹنے کیلئے راجندر سنگھ بیدی نے میں تو کچھ بھی نہیں کی ناؤ بنائی۔ منٹو "میں بھی کچھ ہوں" کے اگن بوٹ پر سوار ہو گیا اور پھر کیسا بانکا کی طرح خود لگائی ہوئی آگ کے شعلوں میں کھڑا ہو کر چلانے لگا۔ میری طرف دیکھو میں بھی کچھ ہوں۔

منٹو نے اپنے دکھ پر "چھوڑ یار" کا غلاف چڑھا کر اسے تمغے کی طرح اپنی چھاتی پر مزین کر لیا۔

"چھوڑ یار میری طرف دیکھ"۔

ہاں منٹو بہت بڑا Exhibitionist تھا۔

"میری طرف دیکھو" کی دعوت کو پر اثر کرنے کیلئے اس نے فحاشی کی پھلجڑیاں چلانے کا ڈھونگ رچایا۔ کالی شلواریں سلوائیں۔ ٹھنڈے گوشت کو کوئلوں پر رکھ کر کھول دو کی سرگوشی چلادی۔

منٹو نے گالیاں کھانے کے دلچسپ طریقے ایجاد کیئے۔ کھائی ان کھائی گالیوں کو جھنڈے پر چڑھا کر لہرایا۔ روزمرہ کے برتاؤ میں جان بوجھ کر انوکھی کلیاں ٹانکیں۔ لیکن یہ سب کچھ "میں تو کچھ بھی نہیں" کو بھلا نہ سکا۔ کانٹا سا دل میں اگا رہا۔ ایک بے نام اضطراب اسے گود میں لے کر جھلاتا رہا۔ آخر اسے بھلانے کیلئے منٹو نے بوتل کا سہارا لیا۔

زندگی میں عورت کے بعد بوتل سب سے بڑی کشش ہے۔ پہلے ابھارتی ہے۔ تھپکتی ہے پھر چور چور کر کے رکھ دیتی ہے۔ بوتل نے منٹو کو تسکین نہیں بخشی زبان دی تو وہ چیخنے لگا۔ "میری طرف دیکھو میں سب کچھ ہوں"۔

منٹو امرتسر کا جھاما جھا تھا اور اوپر سے "میری طرف دیکھو میں سب کچھ ہوں" کے گھوڑے پر سوار ادیب۔ اس نے طیش میں بوتل کی گردن مروڑ دی۔ جانتی نہیں میں کون ہوں میں منٹو ہوں منٹو۔ میں نے گالیوں سے شہرت اخذ کی۔ پریس برانچ کے مولوی محمد حسین کے غم و غصے سے امتیاز کا رس نچوڑا۔ تجھے میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔ بوتل مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی۔

بوتل اور سعادت حسن منٹو کی اس جنگ میں بوتل جیت گئی۔ سعادت حسن مارا گیا اور منٹو بری طرح لڑکھڑاتا رہا۔

منٹو کے اس لڑکھڑانے، گرنے، سنبھلنے، گرنے سے مدوجزر پیدا ہوئی، یہ مدوجزر ایک عظیم تحریک بن گئی۔ اس تحریک کی "مد" کے تحت عظیم چیزیں تخلیق ہوئیں اور جزر کے تحت، خام بے ربط، بے معنی تحریریں۔ لیکن بوتل اور منٹو کی جنگ میں منٹو لڑکھڑا کر ـــــ مر گیا ـــــ اور آج ـــــ آج فضا میں سے آوازیں آرہی ہیں "میری طرف دیکھو میں سبھی کچھ ہوں"۔ "میری طرف دیکھو میں سبھی کچھ ہوں"۔ قاری حیرت سے دیکھتے ہیں۔ ان کے سر احترام سے جھک جاتے ہیں دل محبت سے بھر جاتے ہیں۔ منٹو مر کر جیت گیا۔ بوتل جیت کر ہار گئی۔

منٹو سے میں صرف تب ایک بار ملا۔ اور سعادت حسن سے صرف ایک بار۔

سعادت حسن ایک خوبصورت، نفیس مزاج، ذہین، چلبیلا لڑکا تھا، دو ماں زدہ گھر، سخت گیر باپ، جان چھڑکنے والی ماں۔ نت نئی شرارت کے شگوفے چھوڑنے والے محلے کے نوجوان دوست۔

بنیادی طور پر سعادت میں جھجھک تھی۔ یہ کانٹا دور کرنے کیلئے دوستوں کے ساتھ مل کر ہڑبونگ مچانے میں راحت ملی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متواتر کئی بار دسویں میں فیل ہوا۔ عزیز و اقارب ولایت پاس تھے۔ خود مسلسل فیل۔ کمتری پھوڑا بن گئی۔ ذہن کو دھچکا لگا۔ دکھتی رگ چھڑ گئی۔ عزم جاگا۔ کچھ کر دکھاؤں گا۔ سارا عزم ایک بات پر مرکوز ہو گیا۔ چیخوف کی کہانیوں کا ترجمہ کرنے کی ٹھانی۔ دن رات مطالعہ میں ایک کر دیئے۔ مطالعہ اور محنت۔ دوستوں سے کھیلنے والے نے کتابوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا سعادت طبع زاد چیزیں کیوں نہیں لکھتے۔ بولا ابھی برتن بھرا نہیں۔ بھرے تو اچھلے۔

اسی دور میں سعادت دھندلا پڑتا گیا اور منٹو ابھرتا گیا۔ شاید منٹو نے اس حقیقت کو پالیا کہ بھرنا ضروری نہیں اچھلنا ضروری ہے اور بھرنے کے بغیر بھی آسکتا ہے ـــــ یا شاید منٹو کی شدت کا آتش فشاں پھوٹ نکلا جس نے اچھال کو تنکے کی طرح اٹھا کر پھینک دیا۔

منٹو پہلے سنبھل سنبھل کر پھر مچل مچل کر اچھلا۔ اس اچھل میں ایک نشہ ہوتا ہے جوں جوں وہ منہ لگتا گیا سعادت منٹو میں تبدیل ہوتا گیا۔ پھر اس نشہ کے ٹوٹنے کے ڈر سے منٹو نے بوتل اٹھالی۔ بوتل نے سعادت کو مار دیا اور منٹو کو زندہ کر دیا۔ پھر بھی سعادت کی حیران آنکھیں منٹو کی اوٹ سے مظلوم نگاہوں سے جھانکتی رہیں۔

سعادت بے حد پیارا آدمی تھا۔ اس میں عورت حاوی تھی۔ ذہین ہمدردی سے بند بند بھری عورت ایک چلبلا مگر شریر بچہ "ایک جھاما جھا" سعادت کی شخصیت میں یہ تینوں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ سعادت نے یہ سب کچھ منٹو کو دیا۔ منٹو کی بنیادی خصوصیات وہی سعادت والی ہی رہیں۔ وہی ہمدردی، وہی فیاضی، وہی معصومیت، وہی ذہانت، وہی بذلہ بازی، صرف

اس نے شرمیلی عورت کی آنکھوں میں میری طرف دیکھو کا کاجل لگا دیا۔ ہونٹوں پر میری سنو کی سرخی تھوپ دی۔ سعادت کے گونگے بھاما جھا کو زبان دے دی۔ گونگا بولنے لگا۔

ان دنوں یہ فیشن ہو گیا ہے کہ چمکیلی بات کرو اور انٹیکچول بن جاؤ۔ یہاں وہاں سے ہم لوگ چمکیلی باتیں چنتے رہتے ہیں۔ ان چمکیلے بٹنوں سے جیب بھر کر چائے خانے میں جا بیٹھتے ہیں۔ وہاں بنٹے کھیلتے ہیں۔ بنٹے سے بنٹا ٹکراتے ہیں۔ پھر یہی چمکیلے بنٹے افسانوں کی لڑیوں میں پروئے جاتے ہیں۔ انہیں لڑیوں سے ادب پارے تخلیق ہوتے ہیں۔

چمکیلی بات ذہن میں پھلجڑی چلاتی ہے۔ دل میں گرمی کی رو نہیں چلاتی۔ دور حاضر و چمکیلی باتوں کا دور ہے۔ دل کی مدہم دھڑکنوں کا دور نہیں۔ بے شک منٹو Exhibitionist تھا۔ لیکن وہ دکھاوے کا Exhibitionist تھا۔ اس نے نمائش بازی کا سیاہ نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ نقاب تلے فیشن سے عاری چٹ کپڑی، گھریلو جینئس تھی۔ جس کے دل میں شدت کا آرا چل رہا تھا۔ بند بند میں درد کار چاؤ تھا۔ دیکھنے والی نگاہ تھی۔ بے پناہ خلوص کی دھڑکن تھی۔

شخصیت بھی عجیب معجزا ہے جہاں تضاد ہارمنی پیدا کرتا ہے۔ ہارمنی تضاد پیدا کرتی ہے۔ اس دکھاوے کے Exhibitionist نے سرکس کے جوکر کی طرح بڑے بڑے شاندار کرتب دکھائے۔ کسی نے کہا منٹو آؤ کے عنوان سے لکھو۔ منٹو نے ڈرامہ لکھ دیا۔ کسی مسخرے نے اکسایا منٹو پتھر پر لکھ سکتے ہو۔ منٹو کس چیز پر نہیں لکھ سکتا اور منٹو نے پتھر پر لکھ دیا۔ نہ جانے کیا لکھ دیا۔

پھر ہوتی بولی۔ مجھ سے ملاقات چاہتے ہو تو لکھو۔ بکنے کیلئے لکھو۔ بچنے کیلئے لکھو۔ پبلشر کے آگے سیس نواو۔ قاری کیلئے جنس کی پھلجڑیاں چلاؤ۔ کالی شلواروں میں ٹھنڈے گوشت کی [illegible] باندھو۔ پھر میں تم سے آملوں گی۔ منٹو نے عمدہ کاغذ کا گٹھا اٹھایا۔ ایک ورق پر [illegible] لکھا۔ اور نئے ادارے میں جا بیٹھا۔ یار نذیر ۵۰ روپے دو، نہیں قرض نہیں مانگتا یار، نقد ملے گا۔ ابھی ابھی دو افسانے لکھ کر دوں گا۔ ابھی ابھی۔ ایک نہیں دو افسانے۔

منٹو نے سعادت حسن کے نام سے منٹو کا خاکہ لکھا ہے۔ لکھتا ہے: منٹو اول درجے کا فراڈ ہے، کہتا ہے میں افسانہ نہیں سوچتا، افسانہ مجھے سوچتا ہے۔ دراصل افسانہ لکھتے وقت اس کی وہی حالت ہوتی ہے جیسے مرغی انڈا دیتی ہے''۔

یہ مرغی ہوتی کیلئے انڈے دیتی رہی۔ ایک نشست میں دو دو کاش یہ مرغی انڈوں کو سینا بھی جانتی۔

منٹو بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس نگاہ تھی، زیر لب تبسم تھا۔ آنسوؤں میں خون کی سرخی تھی۔۔۔

لیکن منٹو نے اپنا آپ یوں لٹا دیا جیسے کسی عورت نے محلے والوں کو اپنی نئی انگوٹھی دکھانے کیلئے اپنے گھر کو آگ لگا دی تھی۔

ابن انشاء

پاکستانی فلموں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہیرو کسی حادثہ کی وجہ سے اپنی یاداشت کھو بیٹھتا ہے۔ اسے یاد نہیں رہتا کہ وہ کون ہے اور اس پر کیا بیتا پڑی تھی۔ چہرہ ڈھلک جاتا ہے۔ اظہار جذبات کی قوت مفقود ہو جاتی ہے۔ شخصیت پر بے نام دھندلکا چھا جاتا ہے۔

دسمبر ۱۹۵۷ء میں جب میں نے پہلی بار ابن انشاء کو دیکھا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ پاکستانی فلم کا شاک زدہ ہیرو ہو۔

اس وقت وہ دفتر میں اپنے ڈیسک پر بیٹھا تھا۔ چہرے پر بے تعلقی اور اکتاہٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سامنے پاک سرزمین کی فائل کھلی پڑی تھی۔ جیسے فائل میں سے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ لیکن ظاہر تھا کہ وہ خود کھویا ہوا ہے۔ فائل سے دور۔ ڈیسک سے دور، دفتر سے دور کسی ایسے مقام پر پہنچا ہوا ہے جہاں ابھی اندھیرے اجالوں سے جدا نہیں ہوئے۔

''ان سے ملو یہ ابن انشاء ہیں''۔ احمد بشیر نے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ دفعتاً ایک کایا پلٹ عمل میں آئی، نمیالے اندھیرے میں نین لائٹ جل گئی۔ زمین پر رینگتی ہوئی سونڈی تیتری بن کر فضا میں اڑنے لگی۔ انشاء کا چہرہ مسکراہٹ سے چمکنے لگا۔ اس مسکراہٹ میں مسرت کم تھی۔ خلوص زیادہ تھا۔ چیچپا خلوص۔ بے بسی بھرا خلوص، عجز بھرا خلوص، پرنم خلوص۔

یااللہ ان دونوں میں ابن انشاء کون ہے۔ وہ شاک زدہ ہیرو یا یہ ابلتی ہوئی شدگی

بوتل۔ وہ نمیالا اندھیرا یا یہ مدھم دودھیا نین لائٹ۔ وہ رینگتی ہوئی سونڈی یا یہ اڑتی ہوئی رنگین تتلی۔

آج تک میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ ممکن ہے وہ دونوں مل کر ابن انشاء بن جاتے ہوں۔ جس طرح دن اور رات مل کر یوم بنتا ہے۔ جس طرح آزاد کشمیر میں مظفر آباد کے قریب دو دریا نیلم اور جہلم ایک نیلا اور شفاف دوسرا نمیالا اور گدلا۔ آپس میں ملتے ہیں اور مل کر ایک ہو جانے کے باوجود دور تک ساتھ ساتھ الگ الگ بہتے ہیں۔

بہر طور ابن انشاء کی شخصیت اس نین لائٹ کی مصداق ہے جو جلتی بجھتی رہتی ہے۔ جس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ اس لئے جلتی ہے کہ بجھ سکے یا اس لئے بجھتی ہے کہ پھر سے جل اٹھے۔

اس اولین ملاقات کے بعد ہم روز آپس میں ملنے لگے۔ چونکہ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔

اگر وہ چھوٹا سا مختصر سا دفتر ایک عام سا دفتر ہوتا، اگر اس کی حیثیت روبنسن کروزو کے جزیرے کی سی نہ ہوتی تو شاید اس جلتی بجھتی نین لائٹ سے میں مزید واقفیت حاصل نہ کر پاتا اور ابن انشاء میری دانست میں ہمیشہ کیلئے ایک ایسے ابوالہول کی حیثیت اختیار کئے رہتا جس کے نیچے کوئی تابوت دفن ہو۔

اس دفتر میں ہم اکٹھے کام ہی نہیں کرتے تھے بلکہ رہتے سہتے تھے۔ وہ ہمارا مشترکہ لاج تھا۔ ہماری سیرگاہ تھی جہاں ہم اکٹھے شامیں بسر کرتے تھے۔ ہمارا کلب تھا۔ کافی ہاؤس تھا، جہاں احمد بشیر، ابن انشاء اور میں گپیں مارتے تھے۔ تبصرے کرتے تھے۔ جائزے لیتے تھے۔

اس دفتر میں صرف چار افسر تھے۔ دفتری نقطہ نظر سے ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انہیں علم نہ تھا کہ وہ افسر ہیں اور اگر تھا بھی تو وہ افسر بن کر رہنے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ چاروں ادیب تھے۔

ان افسروں کے ماتحت دس ایک سکہ بند کلرک تھے جو جی حضور کہہ کہہ کر جوان

ہوئے تھے اور اس بے افسر دفتر میں آکر اس بچے کی طرح کھو گئے تھے جو احکامات کی انگلی پکڑ کر چلنے کا عادی ہونے کی وجہ سے خود راستہ تلاش کرنے کی اہلیت کھو بیٹھا ہو اور بالآخر راہبر سے محروم کر دیا گیا ہو۔

اس دفتر کے افسر اعلیٰ ایک عظیم شاعر تھے۔ ان کی شخصیت میں سیال عنصر غالب تھا۔ یہ سیال عنصر پارے کی خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کی لہروں میں دریا کا بہاؤ نہ تھا بلکہ سمندری لہروں کی سی روانی تھی جو گھڑی کے پنڈولم کی طرح چلتی ہیں۔ سمندر کا سا تلاطم تھا۔ چھینٹے اڑتے تھے۔ جھاگ اٹھتا تھا۔ گھمن گھیریاں گھومتی تھیں۔ گرداب پڑتے تھے۔ دفتر کے اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود وہ اپنی نظموں میں افسران پاکستان کو منہ زبانی درس دیا کرتے کہ کرسی نشینی چھوڑو میدان عمل میں آؤ۔

وزارت صحت کے اس شعبے کے افسران جن پر اس دفتر کے نظم و نسق کی ذمہ داری تھی تمام تر دفتر کو غیر صحت مند سمجھتے تھے۔ جیسے گلبرگ کی عالیشان کوٹھی میں بھینس مندھی ہو۔ وہ اس دفتر کے طریق کار کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ اس دفتر پر تمسخر اڑاتے تھے۔ ساتھ ہی اس سے خائف بھی تھے۔

دفتر ان کے نزدیک بذات خود ایک پرابلم تھا۔ انہوں نے اس کا حل یہ سوچا تھا کہ سرد مہری اور بے تعلقی سے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ لہٰذا وہ دفتر کے وجود سے ہی منکر تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ چاروں طرف بے گانگی چھائی تھی جس کی وجہ سے اہل دفتر محسوس کرتے تھے جیسے وہ دفتر ا جنس کروزو کا خود کفیل جزیرہ ہو۔ انہوں نے انتقاماً اسے گھر بنا لیا تھا۔ اور وہ ایک دوسرے کے قریب تر آ گئے تھے۔ ابن انشاء کے ساتھ اس دفتر میں میں نے دو سال بسر کیے۔

دو سال یہ دودھیا نین لائٹ جلتی بجھتی رہی۔ کبھی میں محسوس کرتا کہ ابن انشاء ایک کھلاڑی عورت ہے جو ایک ساعت میں مسکرا کر آپ کی گود میں آ بیٹھتی ہے۔ دوسری ساعت میں آپ کی طرف یوں بے گانہ وار دیکھتی ہے جیسے آشنا ہی نہ ہو۔ کبھی محسوس کرتا کہ

وہ بکار خویش ہوشیار دیوانہ ہے جو ہوشیاری اور دیوانگی دونوں کو کام میں لانا جانتا ہے۔۔۔ کبھی میں محسوس کرتا کہ وہ ایک قلندر ہے جو لا اور الا اللہ کی منزل طے کر رہا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ وہ حادثے کا مارا ہوا مریض ہے جو اپنے دکھ میں ڈوبا رہتا ہے لیکن نرس کو دیکھ کر جی اٹھتا ہے۔

بہر صورت دو سال نین لائٹ جلتی بجھتی رہی۔

جب وہ جل اٹھتی تو ابن انشاء کے خلوص اور محبت سادگی اور عجز کی روشنی سے فضا منور ہو جاتی۔ گل ہو جاتی تو اندھیرا چھا جاتا۔ ایک بے نام دکھ چاروں طرف سے گھیر لیتا۔ ہوا سسکیاں بھرتی۔۔۔ اس اندھیرے اور خوفناک خلا سے ابولہول کا مجسمہ ابھرتا اور اپنی کھوکھ میں مدفون تابوت کی طرف اشارے کرتا۔ اس وقت ابن انشاء کا المیہ چاروں طرف مسلط اور محیط ہو جاتا۔

آج دس سال کے بعد جبکہ ابن انشاء کی "انشائیوں" نے محفل کو زعفران زار بنا رکھا ہے۔ جب شہرت کی لائم لائٹ چاروں طرف سے اس کا حلقہ کیے ہوئے ہے جبکہ بظاہر اس کی بنیادی جھجھک خود اعتمادی کی روشنی میں دم توڑ رہی ہے جبکہ اس کی خلوص بھری مسکراہٹ میں نیا دم خم پیدا ہو رہا ہے۔ جبکہ مساعد حالات نے اسے مکلف قمیض میں لپیٹ دیا ہے۔۔۔ بنیادی طور پر ابن انشاء وہی ابن انشاء ہے۔ مکلف قمیض تلے وہی گدڑی ہے۔ تبسم کے شگفتہ کنول تلے وہی آنسوؤں کی جھیل ہے۔ یونیسکو سوٹ تلے وہی جہاں دیدہ سادھو ہے۔ عالمی سیاح کے لبادے میں وہی راہی جو چلتے چلتے راستہ کھو گیا ہے جسے یاد نہیں کہ وہ کون ہے۔ اس پر کیا بپتا پڑی تھی اور اب اسے کہاں جانا ہے۔

اگرچہ اب "گل ہونے" کے وقفوں کا تواتر اپنی شدت کھو بیٹھا ہے اور یہ وقفے مختصر ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اب اس کے اجالے روشن تر ہو گئے ہیں۔ اندھیرے اس قدر بھیانک نہیں رہے۔ اس کے باوجود آج بھی وہ وہی جلتا بجھتا ابن انشاء ہے۔

مزاح کے اس پتارے کے باوجود جو وہ اٹھائے پھرتا ہے ابن انشاء بنیادی طور پر

ایک شاعر ہے۔ ایک منفرد شاعر۔ ایسا شاعر جو واردات عشق میں اس قدر کھو گیا ہے کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ شاعر ہے اور اسے حسن یار زلف اور رخسار کی باتیں کرنی چاہئیں۔ ورنہ شعروں میں نہ شوخی ہوگی نہ بانک پن۔ لیکن یہ حال مست شاعر محبوب کو بھی بھول چکا ہے۔ اس کی شاعری خالص بیراگ ہے جس میں خلوص ہے، سادگی ہے دکھ ہے۔۔۔ محبوب تو ایک بہانہ ہے ایک جواز۔ ایک موہوم سی جسمی کیفیت۔

شاعری ہی نہیں ابن انشاء کے عشق کی تفصیلات بھی منفرد ہیں۔ عام طور سے عاشق بڑے بڑے جرنیلوں کی طرح واپسی کی کشتیوں کو آگ لگا دیتے ہیں تاکہ عشق کے میدان میں پیٹھ دکھانے کا خطرہ نہ رہے۔ ابن انشاء واپسی کی کشتیوں کو آگ نہیں لگاتا جب واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو کشتیوں کو جلانے سے کیا فائدہ۔ اس کے برعکس ابن انشاء آگے بڑھنے کی کشتیوں کو آگ لگا دیتا ہے تاکہ کہیں عشق میں کامیابی کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ کہیں وہ بیراگ کو چھوڑ کر محبوب کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ کہیں وصال کی قیامت نہ ٹوٹ پڑے۔

ابن انشاء کے قریبی حلقے اس سے متفق نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آگے بڑھنے والی کشتیوں کو جلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ وہ پہلے سے ہی سوچ سمجھ کر عشق کے کوائف کچھ اس انداز سے ترتیب دیتا ہے کہ کامیابی کا خفیف سے خفیف امکان نہ رہے۔ ایسے محبوب کا چناؤ کرتا ہے جو پہلے ہی سے کسی اور کا ہو چکا ہو۔ جس کے دل میں انشاء کیلئے کوئی جذبہ نہ ہو۔ جو پہنچ سے بہت دور ہو، بہت دور، اور جسے ملنے کے تمام راستے قطعی طور پر مفقود ہوں۔ اپنے آپ کو پورے طور پر محفوظ کر لینے کے بعد وہ عشق کے ساز پر بیراگ کا راگ الاپنے لگتا ہے۔

بہر صورت حیرت کی بات ہے کہ ابن انشاء کی شخصیت میں نہ تو شاعر کا رنگ ہے اور نہ عاشق کا۔

رابطے کے اولیں دور میں میں سمجھتا رہا کہ اوڑھاوے کے نیچے مدفون تابوت کو عشق

سے تعلق ہے۔ لیکن ابن انشاء کے عشق کے کوائف کو دیکھ کر یہ مفروضہ دم توڑ کر رہ گیا۔

کبھی کبھار مجھے شک پڑتا ہے کہ ابن انشاء کا عشق بذات خود ایک راہ فرار ہے۔ اس مدفون تابوت سے فرار لیکن شاید ابن انشاء خود اس مدفون تابوت کو بھول چکا ہو۔ شاید سانپ نکل گیا ہو صرف لکیر باقی ہو۔ لیکن جذبات کی دنیا میں سانپ نہیں لکیریں اہم ہوتی ہیں۔ گزرے ہوئے سانپوں کی لکیریں۔

چاہے آپ سارا دن ابن انشاء کے پاس بیٹھے رہیں اس کی کسی حرکت یا بات سے آپ پر یہ ظاہر نہ ہوگا کہ وہ شاعر ہے نہ وہ شعر و ادب کا تذکرہ چھیڑے گا نہ اپنا کلام سنانے کی کوشش کرے گا۔ اس کی شکل و صورت پر بھی شعر و ادب کی چھاپ نہیں۔ نہ بالوں کا سٹائل فن کارانہ ہے، نہ آنکھوں میں وہ خود ساختہ مستی ہے جو شاعر لوگ بڑی محنت سے پیدا کرتے ہیں۔ اس نے گفتار میں کبھی "اہل زبانیت" پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اپنی واضح پنجابیت پر فخر محسوس کیا۔

ابن انشاء شاعرانہ شخصیت کے لوازم سے واقف تو ہے مگر طبعاً ان سے بے نیاز ہے۔ عاشقانہ انداز سے وہ قطعی طور پر بے گانہ ہے۔ اس کے کھوئے کھوئے انداز کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ عشق کا مارا ہوا ہے۔ لیکن قریب سے دیکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے کھوئے پن میں تڑپ کا عنصر نہیں، تلاش و جستجو کا عنصر نہیں۔ الٹا وہ اس کھوئے پن میں یوں مطمئن دکھائی دیتا ہے جیسے بطخ جوہڑ میں تیر رہی ہو۔ اگر کھویا پن عشق کی وجہ سے ہے تو ابن انشاء کا عشق فن برائے فن کی مصداق ہے۔

یہ کھویا پن ابن انشاء کی طبیعت کا جزو اعظم ہے۔ اس کھوئے پن نے چاروں طرف سے اسے گھیرے میں لے رکھا ہے جیسے وہ خلا میں لٹکا ہوا گرہ ہو اور کبھی کبھار مسکراہٹ کی کرن کے ذریعے زمین سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہو۔

بڑی سے بڑی دلچسپ جزئیات ابن انشاء کو جذب نہیں کر سکتی۔ اس لحاظ سے ابن انشاء الٹی ایک لکیر ہے جو زندگی کے دائرے سے چھو کر نکل جاتی ہے دائرے کے اندر داخل

نہیں ہوتی۔ آپ اسے قتل کی لرزہ خیز داستان سنائیں ابتدا میں وہ بظاہر بڑے شوق سے سنے گا لیکن جلد ہی آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے خلا میں ڈوب چکا ہے اور اخلاقاً ہاں ہاں کہہ کر آپ کو اپنی توجہ کا یقین دلا رہا ہے۔ اس لحاظ سے ابن انشاء ایک عظیم الجثہ پکھوا ہے۔ اس کی جمود بھری بے حس ذات یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ہے صرف سر میں حرکت ہے جسے وہ دیر تک خول سے باہر نہیں رکھ سکتا۔ ہر چند ساعت کے بعد وہ اپنے خول میں دبک جانے پر مجبور ہے۔ خول میں دبک جانا اس کیلئے زندگی ہے۔

ابن انشاء ازلی طور پر تنہا ہے، تنہا اور اکیلا۔ اس کا یہ خول ایک خلا ہے۔ خوشی، بیاس، غم، دکھ اور یادوں سے پاک خلا۔ ایک ایسا خلا جہاں ہر وقت دن اور رات ملتے ہیں اور شام کا دھند لکا چھایا رہتا ہے۔ اس بے نام خلا میں رہنے کی وجہ سے ابن انشاء سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ بظاہر ان حرکتوں پر بد حواسیوں کا گمان ہوتا ہے لیکن قریب سے دیکھیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ وہ بد حواسیاں نہیں بلکہ ابن انشاء کی مخصوص "خلائیاں" ہیں۔

کراچی میں کئی بار ایسا ہوا کہ سڑک کی دوسری پٹڑی سے ابن انشاء نے مجھے پکارا "ادھر آنا ضروری بات ہے" جب سڑک پار کر کے اس پٹڑی پر پہنچا تو ابن انشاء کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دیر تک اس کی تلاش کی مگر وہ نہ ملا۔ جب پہلی مرتبہ یہ واقعہ ہوا تو اگلے روز میں نے دفتر میں پوچھا "مجھے آواز دے کر تم کہاں چلے گئے تھے"۔ اس کا جواب سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ "اچھا" وہ بولا "میں چلا گیا تھا"؟ یہ جواب بے حد پریشان کن تھا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کہنے لگا۔ "مجھے بھی خیال آیا تھا کہ مجھے رکنا چاہیے لیکن بس جو آگئی تھی، میں چلا گیا"۔

ابتدا میں اس کی ان "خلائیوں" سے میں بہت حیران ہوا۔ جب بھی میں نے ابن انشاء سے وضاحت چاہی تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا ایسا کیا تھا میں نے"۔ اس کے انداز میں اس قدر معصومیت اور خلوص ہوتا کہ پھر مجھے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

اگر ابن انشاء آپ کو دعوت دے تو بے شک اس کی دعوت قبول کر لیجئے چونکہ وہ ایک بے حد مخلص آدمی ہے۔ وقت مقررہ پر وہ یقیناً ہوٹل یا ریستوران میں پہنچ کر میزبان کے فرائض ادا کرنے میں مسرت محسوس کرے گا۔ لیکن کھانے کے دوران میں اگر وہ باتھ روم میں جانا چاہے یا باہر جا کر تھوکنا چاہے تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ اس کے ہمراہ جائیں ورنہ تعجب نہ ہوگا کہ وہ باتھ روم سے نکل کر سیدھا باہر چلا جائے اور ان جانے میں بس یا ٹیکسی دیکھ کر اس میں سوار ہو کر گھر پہنچ جائے اور اگلے روز آپ اس سے پوچھیں تو وہ اپنی مخصوص معصوم مسکراہٹ سے کہے "اچھا کیا واقعی میں نے ایسا کیا"۔

انہی دنوں وزارت صحت کے حکم کے مطابق ابن انشاء کو دورے پر جانا پڑا۔ دفتر کا نائب ڈائریکٹر احمد بشیر میرے پاس آیا کہنے لگا۔ "ابن انشاء لاہور نہیں جائے گا"۔ "کیوں"؟ میں نے پوچھا۔ "بس نہیں جائے گا"۔ وہ بولا۔ "ابن انشاء لاہور نہیں جا سکتا"۔

دو روز کے بعد ابن انشاء لاہور روانہ ہو گیا۔ اس روز ہم دونوں احمد بشیر اور میں اسے اسٹیشن پر چھوڑنے گئے۔ ابن انشاء فکر مند نہ تھا۔ "لاہور ہی ہے نا، تو ہو آؤں گا لاہور سے، یہ تو اور بھی اچھا ہے ٹی اے بنے گا"۔ گاڑی روانہ ہو گئی تو میں نے احمد بشیر سے کہا۔ "تم تو کہتے تھے یہ لاہور نہیں جائے گا، حیرت ہے"۔ احمد بشیر بولا۔ "ویسے یہ بات تو مسلم ہے کہ ابن انشاء لاہور نہیں جا سکتا"۔

اگلے روز جب ہم دفتر میں بیٹھے تھے تو دفعتاً ابن انشاء داخل ہوا اس کے ہونٹوں پر وہی معصوم اور پر خلوص مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا یار کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میں کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر دفعتاً گاڑی رک گئی۔ میرے سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔ ڈبے سے باہر نکلا۔ وہ ایک جنکشن اسٹیشن تھا گاڑی کافی دیر رکتی تھی۔ میں نے سگریٹ خریدے چائے کا پیالہ پیا۔ پھر واپس ڈبے میں آ کر مطالعہ میں مصروف ہو گیا اور گاڑی چل پڑی۔ آخر گاڑی رک گئی اور سب مسافر باہر نکلنے لگے میں بھی باہر نکل آیا۔ اسٹیشن کے باہر رکشا لیا۔۔۔ اب جو دیکھتا ہوں تو رکشا میرے گھر کے سامنے کھڑا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ

گاڑی لاہور جانے کی بجائے واپس کراچی آ گئی"۔

انشاء کا بیان سن کر میں سمجھا کہ یہ بھی اس کی ایک "خلائی" ہو گی۔ جنکشن پر دو گاڑیوں کا میل ہو گا۔ سگریٹ خرید کر وہ غلطی سے کراچی آنے والی گاڑی میں سوار ہو گیا ہو گا۔

احمد بشیر میری بات سن کر مسکرایا۔ بولا "کیا سگریٹ خریدنے کیلئے یہ لازم ہے کہ سوٹ کیس اٹھا کر ساتھ لے جایا جائے"۔ مجھے احمد بشیر کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے اس کی طرف تجسس آمیز نگاہوں سے دیکھا "دیکھو مفتی" وہ بولا "اگر یہ غلطی سے کراچی والی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا تو اس کا سوٹ کیس اس کے ساتھ کس طرح سے آ گیا اسے تو لاہور پہنچ جانا چاہیے تھا"۔

چار ایک دن کے بعد میں نے انشاء سے بات کی "تم تو سگریٹ خرید کر غلطی سے کراچی آنے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ لیکن تمہارا سوٹ کیس تمہارے ساتھ کس طرح آ گیا"۔ بولا "سچ کیا سوٹ کیس میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں"؟ اس کے اس سوال میں بناوٹ کا عنصر نہ تھا۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا کر بولا "ہاں یار سوٹ کیس تو واقعی گھر پڑا ہے، ساری بات ہی عجیب ہے"۔ اس کے چہرے پر حیرت نہیں مسرت کھیل رہی تھی۔

احمد بشیر، میں نے پوچھا۔ "کیا انشاء جان بوجھ کر کراچی واپس آ گیا ہے"۔ احمد بشیر نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ان جانے میں سوچے سمجھے پلان کے مطابق اس نے لاہور جانے سے اپنے آپ کو بچا لیا ہے۔ لاہور ابن انشاء کا چھوڑا ہے۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ آیا لاہور کا چھوڑا چھوٹ گیا یا وہ مدفون تابوت کسی اور مقام پر منتقل ہو گیا پتہ نہیں وہ کوائف کیا تھے جن کے تحت ابن انشاء نے لاہور کا ساودنڈ بیریر توڑ دیا۔ اور وہ لاہور پہنچ گیا اور اس نے لاہور میں ایک مکان الاٹ کروا لیا۔ لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ لاہور پہنچ کر بھی لاہور نہ پہنچا ہو۔ لاہور میں رہنے کے باوجود لاہور سے کوسوں دور رہتا ہو۔

جانے کی معصومیت سادگی اور خلوص کے باوجود ان جانے کی عیاری اور پرکاری میں اس ابلیس کا جواب نہیں۔ لیکن یہ فتنہ خوابیدہ صرف اس وقت بیدار ہوتا ہے جب ابلیس کا وہ ونڈرلینڈ خطرے میں ہو۔ جب اس کی خلائیوں پر ضرب پڑنے کا امکان ہو۔

ابن انشاء کو غصہ نہیں آتا۔ آپ اسے جو بھی چاہے کہہ لیں۔ غصے کی آمد کا خطرہ محسوس کر کے دفع کیلئے اس کی مسکراہٹ میں مزید چمک پیدا ہو جائے گی۔ اس کے مزاح کی حس میں مزید شدت پیدا ہو جائے گی۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے گا۔ اگر بات بہت ہی بڑھ جائے اور خطرے کی حدود کو چھونے لگے تو دھند کے میں طوفان آ جانے کا اور وہ یوں آنسو پینے میں مصروف ہو جائے گا جیسے مفت کی ہو۔

جسے غصہ نہ آئے آپ بھی اس پر غصہ نہیں کر سکتے۔ میں نے خود دو ایک مرتبہ ابن انشاء پر غصہ اتارنے کی کوشش کی ہے۔ چند ساعت تو میں بوکھلاتا رہا۔ پھر دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو اذیت دے رہا ہوں اور بھرے مجمع میں تماشا بنا ہوا ہوں۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس پر ابن انشاء میرے قریب آ گیا اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں تازہ روشنی تھی۔ بولا "مفتی جی آپ چپ کیوں ہو گئے"۔ اس کی آنکھوں میں پھوار سی پڑ رہی تھی۔

ابن انشاء ضد اور جذبہ انتقام سے واقف نہیں۔ جسے غصہ نہ آتا ہو وہ انتقام سے کیسے واقف ہو سکتا ہے ۔۔۔۔ لیکن کبھی کبھار مجھے شک پڑتا ہے جیسے وہ اپنے آپ کو اپنے تمام تر غصے اور انتقام کا نشانہ بنا چکا ہو۔ غصے کی آگ سے اس نے اپنی میں کو جلا ڈالا ہو اور پھر جلی ہوئی لاش کو تابوت میں رکھ کر اپنی انا کی گہرائیوں میں ڈبو دیا ہو۔ اس گذشتہ آتش فشانی کا دھواں آج تک اٹھ رہا ہے۔

ابن انشاء کے ڈھلکے ہوئے چہرے اور دھندلائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کوئی ذہین بات کہہ سکتا ہے۔ اولیں دور میں اس مفروضے کی وجہ سے میں اس کی باتیں سن کر کئی بار چونکا۔

ذہانت کے علاوہ اس کی باتوں میں گہرائی اور انفرادیت ہوتی ہے۔ ایسی بات کہتے ہوئے اس کی آنکھ میں "دانشورانہ چمک" پیدا نہیں ہوتی۔ "دیکھا کیا بات کی ہم نے" کی سی چمک۔ نہ ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے کوئی دور رس بات کی ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ بظاہر کسی معمولی سے کام میں لگا رہتا ہے۔ اور یوں بات کرتا ہے جیسے بر سبیل تذکرہ ہو۔ اگرچہ بات کہتے وقت اس کے ہونٹ کھل جاتے ہیں جیسے وہ خود اپنی بات کا مزا لے رہا ہو۔

کئی ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ابن انشاء نے دور رس بات کی۔ میں چونک گیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ "یار ابن انشاء یہ تو نے کیا بات کی"۔ "کون سی"؟ اس نے پوچھا۔ جواب میں میں نے اس کی بات دہرائی۔ سن کر اس کے ہونٹوں پر تبسم لہرایا۔ "اچھا وہ، میں نے یہ بات کی تھی"؟ پھر معمولی سے وقفے کے بعد کہنے لگا "مفتی جی کہیں آپ اپنی باتیں میرے منہ میں تو نہیں ڈال رہے"۔

ابن انشاء کی باتیں دانشور کی باتوں سے مختلف ہوتی ہیں وہ ذہن سے نہیں بلکہ دل سے پھوٹتی ہیں۔ ان میں خشک عقل دلیل یا ذہانت نہیں ہوتی ان میں دکھاوے کی رنگینی نہیں ہوتی۔ ان میں مغربی خیال کا زاویہ نہیں ہوتا وہ چینی کی رکابی میں رکھ کر پیش نہیں کی جاتیں۔ بلکہ وہ چنگیر میں میلے سے رومال میں لپیٹ کر پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی نظر میں وہ بھونڈی معلوم پڑتی ہیں لیکن جلد ہی وہ باتیں آپ کے اندر دھنس جاتی ہیں۔ گدگداتی ہیں اور جب آپ ہنسنے لگتے ہیں تو معاً آپ کو خیال آتا ہے کہ کتنی پتے کی بات ہے۔ کتنی بڑی حقیقت کو ملفوف کئے ہوئے ہے۔ سیدھی دل سے نکلی ہوئی گداز بھری ملفوف حقیقت اور۔۔۔ آپ کی ہنسی کافور ہو جاتی ہے۔

ابن انشاء چمکیلی باتوں سے قطعی طور پر محروم ہے۔ کرے بھی تو اس کا بات کرنے کا انداز الفاظ کا چناؤ گویا اسے مٹی میں لت پت کر دیتا ہے۔ اس کی نئی سے نئی بات بھی یوں سنائی دیتی ہے جیسے دقیانوسی ہو۔ چمکیلی اور نئی بات کو میلی اور دیہاتی بنا دینے میں اسے غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ اس کی وجہ اس کا طبعی عجز ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا مزاح تحریر میں تکھ تا

ہے منہ زبانی نہیں۔

ابن انشاء کی مزاح نگاری کی صلاحیت کے متعلق سب سے پہلے قدرت اللہ شہاب نے مجھے بتایا۔ انہوں نے انشاء کے چند ایک خطوط میرے سامنے رکھ دیئے۔ وہ تحریریں بے حد لطیف اور رنگین تھیں۔ میں نے کبھی ایسے رنگین خطوط نہیں دیکھے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ابن انشاء کے خطوط اس کی شخصیت کو جھٹلا رہے تھے۔ کہاں خطوط کی شوخی، رنگینی اور بانکپن اور کہاں اس کی شخصیت کے دھندلکے میں ڈوبتی ہوئی مسکراہٹ کی ایک کرن۔

اس کے خطوط پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ اس نے خود لکھے ہیں۔ آپ اس کے کالم کو پڑھ کر اس کے خطوط کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کے خطوط پڑھ کر میں محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی طوائف چولہے کے پاس بیٹھی اپنی لگن میں گنگنا رہی ہو۔ کالم میں وہ پشواج پہن کر محفل میں آکھڑی ہوتی ہے اور آپ کو خوش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہے۔

ایک روز میں نے کہا "انشاء تم مزاح کیوں نہیں لکھتے" "اچھا مفتی جی" اس نے مسکرا کر کہا "اب کیا مجھ سے مزاح لکھواؤ گے" پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا "مفتی جی شعر کہہ کر ہم نے کون سے تیر مارے جو اب مزاح لکھیں"۔

میرا اندازہ ہے کہ کالم نگاری اس نے کسی مالی ضرورت کے تحت شروع کی تھی۔ غالباً مکان کی قسطوں کی ادائیگی نے زچ کر دیا ہوگا۔ پھر کالم نے ایک پھلجڑی سی چلا دی اور ابن انشاء اچنبے میں رہ گیا۔ دل میں حیرت بھری خوشی کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ اس خوشی کو براہ راست کالم کی مداح سرائی سے تعلق نہ تھا۔ براہ راست آنکھوں پر بٹھائے جانے کے نشے سے واسطہ نہ تھا۔ آنکھوں پر بٹھائے جانے اور مداح سرائی کے عمل سے دل میں لگے ہوئے کانٹے کی چبھن میں تخفیف ہو گئی تھی۔ شخصیت کے دھواں دھار اندھیرے میں دم گھٹنے میں افاقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ کالم نے ذیابیطس کے مریض کیلئے انسولین کے ٹیکے کا کام دیا۔ سالوں کا صاحب فراش کھاٹ سے اٹھ بیٹھا۔ صحت نے چاروں طرف زندگی کے رنگین

نظارے پھیلا دیئے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ اب آزاد تھا۔ نفس نیم شب میں اپنے ہاتھوں سے دی ہوئی گرہوں کے بندھنوں سے آزاد تھا۔ اس نئی خوشی اور انوکھی آزادی میں وہ سب کچھ بھول گیا۔

اب وہ اس نسولین کے ٹیکے کو اٹھائے پھرتا ہے۔ اپنے دوستوں سے پوچھتا ہے۔ تم نے میرا وہ کالم پڑھا تھا۔ اپنی جیب سے اخبار خرید کر آپ کو پیش کرتا ہے "آپ نے اخبار نہیں پڑھا آج۔ دفتر میں ملاقاتیوں کے سامنے کالم کے تراشوں کی فائل رکھ کر معذرت کرتا ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں پانچ منٹ میں یہ نوٹ دیکھ لوں، پھر اکٹھے چلیں گے۔ عجیب بات ہے وہ ابن انشاء جس نے کبھی راہ گیروں اور ملاقاتیوں کو اپنے تازہ شعروں سے نہیں نوازا تھا وہ ابن انشاء جس کے ادیب دوستوں پہ منکشف نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک تازہ نظم ختم کر کے بیٹھا ہے۔ وہ ابن انشاء جو اپنے کلام کو چھپا ہوا دیکھنے کیلئے کبھی بے قرار نہ ہوا تھا۔ اب اپنے کالموں کا پلندہ بغل میں دبائے پھرتا ہے۔ وہ ابن انشاء جو جواہرات کو اپنے چیتھڑوں میں ڈھانپے رکھتا تھا۔ اب ٹیڈی پیسوں کی گٹھڑی کندھے پر اٹھائے پھرتا ہے۔ اس پر ہم سمجھتے ہیں کہ ابن انشاء کو شہرت کی دھوپ میں غسل فرمانے کا شوق چرایا ہے۔ اسے آنکھوں کا تارا بن کر چمکنے کی لت پڑ گئی ہے۔ نہیں یہ بات نہیں۔ اگر شہرت اس کے سر کو چڑھ جاتی تو اس کی چھاتی تن جاتی۔ آنکھوں سے نخوت جھانکتی۔ قریب رہنے والوں کو پتہ ہے کہ کالم نے اسے بیساکھی عطا کی ہے۔ لنگڑا کر چلنے لگا۔ لیکن ابھی تک اسے احساس ہے کہ وہ بیساکھیوں پر چل رہا ہے ٹانگوں پر نہیں۔ اور وہ اس احساس کو بھلانے کیلئے بیساکھیوں کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔

نوجوانی ہی میں ابن انشاء پر ایک بھرے ہوئے گھر کو چلانے کا بوجھ پڑ گیا۔ عرصہ دراز تک حالات سازگار نہ ہوئے اور بوجھ اٹھاتے اٹھاتے وہ بابو بن گیا۔ اسے بوجھ اٹھانے کی لت پڑ گئی۔ پھر جب حالات سازگار ہو گئے تو بابو گھبرا گیا۔ اب کیا ہوگا۔ اب بوجھ کے بغیر میں کیسے چلوں گا۔ ٹھوکریں لگیں گی۔ توازن کیسے قائم ہوگا۔ وہ روز خالی ٹوکرا اٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور ملتجی نگاہوں سے افراد خانہ کی طرف دیکھتا۔ ملتجی پر امید نگاہوں سے دیکھتا۔ حتیٰ کہ افراد

خانہ اس کے راز سے واقف ہو گئے انہیں بابو پر ترس آ گیا۔

۱۹۵۸ء میں ایک روز وہ میرے پاس آیا، بولا "مفتی جی کوئی مصروفیت نہ ہو تو میرے ساتھ چلو، شاپنگ کریں"۔

آج کل یہ رواج عام ہے شاپنگ کیلئے جاتے ہوئے لوگ کسی نہ کسی کو ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ چیزیں خریدنے کا فیصلہ کرنے میں مدد دے۔ میں نے سمجھا شاید انشاء اس لئے مجھے ساتھ لے جا رہا ہے۔ مجھے شاپنگ سے دلچسپی نہیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میں انشاء کے ساتھ چل پڑا۔

دوکان میں داخل ہونے سے پہلے انشاء نے رازدارانہ مسکراہٹ چمکائی۔ بولا "مفتی جی خریدنے میں نہیں، نہ خریدنے میں مدد کرنا"۔

اس روز چار ایک گھنٹے ہم دونوں شاپنگ کرتے رہے۔ آخری دوکان میں جب انشاء نے ایک نکٹائی کی قیمت پوچھی تو میں نے حسب معاہدہ نکٹائی کے نقائص گنوانے شروع کر دیئے۔ جب دوکاندار کاؤنٹر کی طرف گیا تو انشاء نے منت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا، بولا "مفتی جی ایک نکٹائی تو خرید لینے دو"۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ایک روز ابن انشاء بہت پریشان بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا "بات کیا ہے"؟ اس پر وہ اور بھی گھبرا گیا۔ میرے مسلسل اصرار پر بولا۔ "مفتی جی بڑی مشکل میں پڑا ہوں" بڑی مشکل کے بعد پتہ چلا کہ وہ اپنے ایک ایسے دوست سے ملنے اس کے گھر گیا تھا جو مالی مشکلات کے دور سے گزر رہا تھا۔ دروازے پر مالک مکان کھڑا تھا۔ جو دو ماہ کے کرایہ کے تقاضے کیلئے آیا تھا۔ ابن انشاء نے مالک مکان کو کرایہ ادا کر دیا۔ دوست سے ملاقات کے دوران اس نے بارہا کوشش کی کہ اسے بتا دے کہ کرایہ ادا کر دیا گیا ہے لیکن ہمت نہ پڑی اور اب اسے یہ فکر کھائے جا رہا تھا کہ کہیں مالک مکان دوبارہ کرایہ وصول نہ کرے۔ اسے یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ دوست کو یہ علم ہو کہ کرایہ انشاء نے ادا کر دیا ہے۔

انشاء کو سمجھانا، دلیل دینا، جذباتی اپیل کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

اسے بدلنا ممکن نہیں اس پر اثر انداز ہونا ممکن ہے۔ اس کے برتاؤ کے خلاف احتجاج کرنا یا اس سے روٹھنا بے معنی ہے۔ اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش لاحاصل ہے۔

آپ ایک حد تک اس کے قریب جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد دھندلے کی دیوار درمیان میں حائل ہو جاتی ہے۔ اس دیوار میں کوئی دروازہ نہیں جس سے آپ اندر داخل ہو سکیں۔

ایک حد تک آپ انشاء کی توجہ جذب کر سکتے ہیں۔ چونکہ وہ زیادہ دیر تک اپنے خول سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ ازلی طور پر اکیلا اور تنہا۔۔۔ شاید دھندلے کی فصیل اس نے التزاماً اپنے گرد تعمیر کر رکھی ہو تاکہ اس کی تنہائی اور علیحدگی پر کوئی حملہ آور نہ ہو سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابن انشاء قیدی کی طرح دھندلکے کے اس جالے میں محصور ہو جسے اس مدفون مکڑی نے انتقاماً اس کے گرد تان رکھا ہے۔

آج سے تین سال پہلے میں نے ابن انشاء کو لکھا تھا کہ وہ میرے ایک پبلشر دوست کیلئے اپنا خاکہ لکھ بھیجے۔ ابن انشاء نے اپنی شخصیت کے متعلق جو کچھ لکھا وہ حرف بحرف ذیل میں درج ہے۔ اپنی شخصیت کے متعلق اس کی کیا رائے ہے ملاحظہ ہو:

تم نے جو اسکیچ مانگا ہے اس کی نوعیت معلوم نہیں ہوئی اگر تھرڈ پرسن میں چاہیے تو میں کیوں لکھوں تم خود کیوں نہ لکھو۔ لیکن نہیں میاں، تمہارا کچھ اعتبار نہیں ہے کیا لکھ دو۔ لہٰذا اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ چند سطریں لکھتا ہوں۔ انہیں کو گھٹا بڑھا لو۔

مشرقی پنجاب کے دوابے کا دہقانی کہیں بھی پہنچ جائے لاہور کہ دہلی، لندن کہ کیلفورنیا اپنی ادا سے فوراً پہچانا جاتا ہے۔ یہ لوگ لکھتے بھی ہیں تو وارث شاہ کے استاد کے بقول مونج کی رسی میں موتی پروتے ہیں لیکن ابن انشاء کو موتی چنداں نہیں بھاتے۔ اپنی مونج کی رسی میں وہ کاٹھ کے منکے پروتا ہے۔ اس کا محاورہ اور لہجہ دلی لکھنو ہر جگہ کی سکہ بندی سے دور ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہی سلیقے کی بات اس نے کی ہے۔ ورنہ ادب کے بازار میں جس کی تعریف پوچھو، اپنے کوفا اور موتیوں کا خاندانی سوداگر بتاتا ہے۔

ابن انشاء کو بار بااللہ کا شکر ادا کرتے دیکھا گیا ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی صاحب دیوان یا بے دیوان شاعر نہیں ہوا۔ ورنہ اسے یا تو اس کے نام کا سہارا لینا پڑتا یا اس کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا۔

سید انشاء اللہ خان انشاء سے بھی اس کی نسبی نسبت نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہے اور خطوں میں اسے سید ابن انشاء تک لکھتے ہیں۔ یہ چاہتا تو اس نسبت سے سید بن سکتا تھا۔ لیکن یہ عزت سادات بھی اسے مرغوب نہیں ہوئی۔ اپنی دہقانیت میں خوش ہے اور اللہ اسے اسی میں خوش رکھے۔

پڑھائی کو دیکھئے تو اس نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے۔ تجربے کو دیکھئے تو بہت پاپڑ بیلے ہیں اور ایران توران بلکہ فرنگستان تک گھوما ہے۔ مطالعے میں اردو، پنجابی اور انگریزی سے باہر فارسی اور ہندی سے بھی شغف ہے۔ نظم نثر سبھی میں قلم آزمائی کی ہے۔ لیکن اپنے لئے باعث عزت فقط شاعری کو سمجھتا ہے۔ شاعری جس میں جوگی کا فقر، طنطنہ، وارفتگی اور آزاردگی ہے۔ بات چیت کیجئے تو بعض اوقات بقراطیت بھی چھانٹے گا۔ لیکن اصل میں بقراطوں سے نفور ہے۔ فقط انشاء جی ہے بقول خود:

شاعر ہے تو ادنیٰ ہے عاشق ہے تو رسوا ہے
کس بات میں اچھا ہے کس وصف میں عالی ہے۔

بچوں کیلئے بھی شاعری کی ہے۔ لیکن ایسی نظمیں تو بچے بھی لکھ سکتے ہیں۔ یا شاید بچے ہی لکھ سکتے ہیں۔ نثر لکھنے کا انداز شگفتہ ہے جسے مزاح لطیف بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس ذیل میں کم لکھتا ہے۔ حالانکہ اس کا میدان یہی ہوتا تو خوب ہوتا۔

خاموش ہے عزلت گزیں ہے، پھکڑ ہے، ذمہ داریاں قبول نہیں کرتا تاکہ نبھانی نہ پڑیں۔ فخر صرف اپنے دوستوں پر کرتا ہے جو اس پر یا اس کی سادگی، بھولپن یا احمق پن پر جان چھڑکتے ہیں اور ناز اٹھاتے ہیں۔

عشق بھی کرتا ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ میاں قیس کے انتقال کے ساتھ یہ قوم

ناپید ہو گئی تھی وہ اس سے ملیں یہ ہماری نہیں ابن انشاء کی اپنی فرمائش ہے۔

انشاء جی سے ملو اس سے نہ روکیں گے ولیکن
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی
مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی

قدرت کی شخصیت

اور ممتاز مفتی

قدرت کی شخصیت کے متعلق ایک بات یقینی ہے۔ قدرت اللہ کی شخصیت ممتاز مفتی کا المیہ ہے۔

قدرت اللہ سے میں ۱۹۵۸ء میں متعارف ہوا۔ اس کی شخصیت کے صرف چند ایک پہلو تھے جو بہت واضح تھے۔ بالکل نمایاں، کوئی تضاد نہ تھا، کوئی الجھاؤ نہ تھا۔ صندوق میں تالا ت کیا ہوتا وہاں کوئی صندوق ہی نہ تھا۔ کوئی چیز مقفل نہ تھی۔ ہر چیز باہر پڑی تھی۔ چیزوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جیسے اناج منڈی میں اناج کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ اس منڈی میں چار ایک ڈھیر تھے۔ انکساری، رواداری، سادگی اور مٹھاس۔ ذہانت تو تھی لیکن اس میں شومار نے والی چمک نہ تھی۔ جیسے پیتل دیگچی پر الترااماً مٹی کا کوٹ کر رکھا ہو۔ ۱۹۵۹ء تک میں قدرت اللہ کی شخصیت کو کماحقہٗ ہو سمجھتا تھا۔

۱۹۶۰ء میں مجھے شک پڑنے لگا کہ قدرت اللہ کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس سے میں واقف نہیں۔ اس شک کے محرکات تھے تو خارجی لیکن بہت مبہم تھے۔ ان مبہم محرکات نے بے نام محسوسات کو جنم دیا۔ یہ محسوسات جتنے بے نام تھے اتنے ہی شدید تھے۔ اتنے ہی پراثر تھے۔

۱۹۶۱ء میں دفعتاً میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میں قدرت اللہ کی شخصیت کے صرف کچھ حصے سے واقف ہوں۔ ظاہری حصے سے اور اس کی شخصیت کا نیوکلس ایک ایسی سمت میں واقع ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔

اندازہ لگایئے نفسیات کا ایک طالب علم جو تجزیہ شخصیت کا زعم رکھتا ہو اس کیلئے یہ احساس کس قدر تکلیف دہ ہو گا کہ وہ سمجھنے سے نہ سمجھنے کی سمت بہے جا رہا ہے۔

ساری بات ہی عجیب تھی۔ تجزیہ شخصیت کے مسلمہ اصولوں سے ہٹ کر تھی۔ قدرت اللہ کی شخصیت میں دو رخی نہ تھی۔ تفریق و تقسیم نہ تھی۔ اس کی مخفی اور آشکارا شخصیتوں میں تضاد نہ تھا۔ اس کی ظاہری شخصیت میں کوئی الجھاؤ نہ تھا۔

پھر قدرت اللہ کی شخصیت کا اسرار کیا تھا جبکہ تجزیہ شخصیت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق اسرار کا کوئی جواز نہ تھا۔ مخفی شخصیت کے وجود کا جواز نہ تھا۔ پھر وہ مخفی شخصیت کیا تھی۔ کیوں تھی۔

عام طور سے ظاہری شخصیت مخفی شخصیت کو چھپانے کا سرپوش ہوتی ہے اور نفس غیر شاعر کے ذریعے اس کی جھلکیاں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن قدرت اللہ کے نفس شاعر اور غیر شاعر میں ایک ان جانا، ان ہونا ربط تھا جیسے دونوں کو الگ الگ کرنے والی دیوار منہدم ہو چکی ہو اور اندھیرے اُجالے مل کر سحر کا سماں پیدا ہو گیا ہو۔ ہاں ساری بات ہی عجیب تھی۔ ساری بات ہی ان ہونی تھی۔ جو ممتاز مفتی کیلئے ہونی بن گئی۔

بد قسمتی سے کچھ عرصہ کیلئے میں ایک ایسے ادارے سے منسلک رہا ہوں جہاں ہمارا کام تجزیہ شخصیت کی تحقیق تھا۔ اس ادارے میں تجزیہ شخصیت کے محققین کے خیالات مفروضات اور تسلیم شدہ اصولوں کو جاننے کے علاوہ مجھے براہ راست بیسیوں شخصیتوں کا تجزیہ کرنے کا موقع ملا تھا۔

قدرت اللہ کی شخصیت کے اس اسرار نے میرے زعم کو پارہ پارہ کر دیا آپ کے سینے میں رچے بسے زعم کو ٹھیس لگے تو شخصیت کی ناؤ میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت اللہ کی شخصیت کو سمجھتے سمجھتے میری اپنی شخصیت ڈوب گئی۔ اب میری حیثیت ایک Boswell کی ہے جو جانسن کو سمجھتا نہیں اسے جانتا ہے، مانتا ہے اور منا تا ہے۔

وہ کون کون سے خارجی واقعات تھے جنہوں نے اس احساس کو جنم دیا کہ

قدرت اللہ کی شخصیت کا نیوکلس ایک ایسی سمت میں وجود رکھتا ہے جس کا میں احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کا تفصیلی ذکر اس مضمون میں ممکن نہیں۔ یہ تفصیلات علی پور کے ایلی کی دوسری جلد ایلی اور الکھ نگری کا موضوع ہیں۔ علی پور کے ایلی کا عظیم Experience شہزاد تھا۔ الکھ نگری کے ایلی کا عظیم تر Experience قدرت اللہ ہے۔

قدرت اللہ کی شخصیت کے متعلق سب سے پہلی بات جو مجھے کھٹکی یہ تھی کہ قدرت ایک جانا اور مانا ہوا ادیب تھا۔ اس میں تخلیق کی صلاحیتیں واضح تھیں اس قدر شوخ اور واضح کی اس کے تخلیق کردہ ادب پارے چاند کے سامنے چراغ کی حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ اس کے باوجود قدرت اللہ قطعی طور پر ادیب شخصیت کا حامل نہ تھا۔

تضاد اور شدت کی شخصیت کے دو پایہ ستون ہیں۔ تضاد ایسا جیسے بچے کا جیب جس میں چاک چنے، روشنائی رنگین بلٹے خالی گوٹ اور ٹوٹی ہوئی پھرکیاں ایک ساتھ پڑی ہوتی ہیں۔ شدت ایسی جیسے چیونٹیوں کا گھروندا جو اوپر سے ساکن ہے اندر حرکت کے چکر چلتے ہیں۔

ادیب کی شخصیت فقیر خانے کے مصداق ہے ایسا فقیر خانہ جس میں معذور شہنشاہ بستے ہیں جس میں طرح طرح کی گدڑیاں ہیں رنگ رنگ کے پیوند میں اپنے دکھ کو بھلانے کیلئے اور دوسروں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کیلئے قسم قسم کے ہتھکنڈے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ فقیر باہر لنگڑاتا ہے گھر میں دو پاؤں پر چلتا ہے۔ ادیب باہر دو پاؤں پر چلتا ہے، گھر آکر لنگڑاتا ہے۔

بنیادی طور پر ادیب کی شخصیت ایک مظلوم شخصیت ہے۔ شدت کا کوڑا چلتا ہے۔ مظلوم حبشی چیختا ہے قاری جھوم جاتا ہے۔ "پھر عطا ہو" کوڑے کے درد کو بھلانے کیلئے ہر کسی نے اپنا اپنا طریق کار ایجاد کر رکھا ہے۔ یوں ادیب کی شخصیت پر انفرادیت کی چھاپ لگ جاتی ہے۔

کوئی علاج بالمثل پر یقین رکھتے ہوئے ابوالدکھ حفیظ کی طرح دکھ کی دوکان سجا کر

بیٹھ جاتا ہے کوئی ثناء اللہ کی طرح جٹادھاری روپ دھار کر لوہے کے گولوں کا تماشا دکھاتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے "ہم ثناء اللہ نہیں میراجی ہیں، ثناء اللہ کون تھا ہم اسے نہیں جانتے"۔

کوئی اس عورت کی طرح جس نے محلے والوں کو اپنی انگوٹھی دکھانے کیلئے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ کالی شلوار لہرا کر کہتا ہے "یار میری طرف دیکھو، میں پریس برانچ کے ناظم کو یہ شلوار نہ پہنادوں تو میرا نام منٹو نہیں"۔

کوئی اشفاق احمد کی طرح تلقین شاہیاں ایجاد کر لیتا ہے کوئی سادھو منش نش کی طرح سندھ باد جہازی کا بھیس بدل کر قہقہے کی قبا اوڑھ لیتا ہے۔

قدرت اللہ میں نہ شدت تھی نہ تضاد۔ نہ اس میں چیونٹوں کے گھروندے کے چکر چلتے تھے نہ مظلوم حبشی کراہتا تھا۔ اس نے کوئی گدڑی نہیں پہن رکھی تھی۔ اس کی شخصیت ایسا گھرانا نہ تھی جس میں ادیب بستا ہے۔ جیسے کوئی ملا دوپیازہ قصر شاہی میں آ ٹھہرا ہو اور تفریحاً ادیبوں سے دل لگی کرنے کیلئے ادب کی پھلجڑیاں چلا رہا ہو۔ یا جیسے کوئی بیربل کسی قلندر کے آستانے میں آرکا ہو۔ اگر وہ شخصیت ادیب کا گھر نہ تھی تو پھر کس کا گھرانا تھا۔ وہ شاہ کون تھا۔ وہ فقیر کون تھا۔ وہاں کون رہتا تھا جو تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود تخلیق کو اہمیت نہ دیتا تھا جو تصنیف سے ذاتی اہمیت اخذ کرنے سے سراسر منکر تھا۔

قدرت اللہ کی شخصیت سے متعلق دوسری بات جو چکرا دیتی ہے عمومی شخصیت کے روزمرہ پہلو سے متعلق ہے۔

عام دستور ہے کہ شریف آدمی گھر میں چائے خانے میں، ریستوران میں، پارک میں، اڈے پر یا پلیٹ فارم پر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی بہانے مل بیٹھتے ہیں اور پھر کسی نہ کسی کا تذکرہ چھڑ جاتا ہے۔ شرپسندی کی وجہ سے نہیں غیبت کے خیال سے نہیں ویسے ہی وقت کاٹنے کے لئے۔ بات کرنے کیلئے مل بیٹھنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لئے۔

اس اہل کار کی بات چھڑ جاتی ہے جو دام نہیں چام کی رشوت لیتا ہے۔ ایسے مغز بڈھے کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جس کے شانوں پر سکول کی ٹیڈی جزیے کے بڈھے کی طرح

سوار ہے۔

ایسی معصوم محفلوں سے کون واقف نہیں کون ہے جو ایسی رنگین گفتگو میں دلچسپی نہیں لیتا۔ اول تو ایسی بیٹھکوں میں میں آپ ہم سب کو کچھ نہ کچھ کہنا ہوتا ہے اگر کوئی بھلا مانس ٹھنڈے خون کا مریض ہو اور گفتگو میں حصہ نہ لے سکے تو کم از کم وہ غور سے بات کو سنے گا، مسکرائے گا اور پھر مزید غور سے سننے لگے گا۔ ایسی محفل میں میں نے کسی کو جمائی لیتے نہیں دیکھا۔ الا قدرت اللہ کے۔

ارے قدرت اللہ کیا شے ہے۔ دانشور ہے، رنگین مزاج بھی ہے طبیعت بھی شریفانہ ہے۔ پھر شریفانہ بیٹھک میں بیزاری کیوں۔ صرف جمائیاں ہی نہیں لیتا۔ بلکہ اس قدر جسارت کہ موضوع بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

یار دوستوں کی بات چھوڑیئے۔ گھر کی بات لیجئے۔ گھر ایک مقدس جگہ ہے۔ مقدس اور اہم بھی۔ گھر میں فرصت کے وقت میاں بیوی دونوں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر پڑوسیوں کی بات چل نکلتی ہے۔ اس جوان لڑکی کا تذکرہ چھڑ جاتا ہے جس پر بڑی منہ زور جوانی آئی ہے۔ اس بڈھے پنشنر کا ذکر کیا جاتا جو جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ توں توں نئے ولولے سے چوبارے کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر مونچھ مروڑتا ہے اور گلیڈ آئی چمکاتا رہتا ہے۔ متصل رہنے والے جوڑے کی خست کی تفصیلات پر ہنسی کا دور چلتا ہے۔ رشتہ داروں کی چھوٹی چھوٹی کمینگیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ میاں کے دوستوں کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔

اس چھوٹی سی معصوم تفریح کی وجہ سے میاں بیوی ایک دوسرے سے قریب آجاتے ہیں۔ دونوں میں رفاقت کا جذبہ بڑھتا ہے۔ لڑائی جھگڑے کے بغیر وقت کٹ جاتا ہے گھر میں ایک ربط پیدا ہوتا ہے۔ یہ بظاہر چھوٹی سی بات بڑے عظیم نتائج پیدا کرتی ہے۔ خانہ آبادی کی ضامن بن جاتی ہے۔ گھریلو خوشی پیدا کرتی ہے۔ جینے کی آرزو بڑھاتی ہے مجھے قدرت اللہ پر ترس آتا ہے اس کا گھر کیسے چلتا ہوگا۔ وہاں دھول اڑتی ہوگی۔

قدرت اللہ کے گھر کے چند کوائف ملاحظہ ہوں۔

قدرت اللہ کی بیگم صاحبہ ڈاکٹر عفت شہاب ایم بی بی ایس ہیں لیکن گھر میں کوئی بیمار پڑ جائے تو جوشاندے کا پیکٹ منگوایا جاتا ہے۔ مکہ معظمہ میں محترمہ ڈاکٹر کیمسٹوں کی دوکانوں پر اسپغول تلاش کرتی ہیں۔ جب ہالینڈ میں مقیم تھیں تو پاکستان سے ترپھلا منگواتی تھیں۔ پانچ روپے کے ترپھلا پر تیس روپے محصول ڈاک کا خرچ آتا تھا۔

محترمہ ڈاکٹر صاحبہ یوں شوقیہ نفل اور نمازیں پڑھتی ہیں جیسے بچے میٹھی گولیاں چوستے ہیں یا دورِ جدید کے مریض وٹامن کھاتے ہیں۔

قدرت اللہ کا ایک بیٹا ہے جس کا نام ثاقب شہاب ہے ماں باپ نے پیار سے بچے کا جو پٹ نام (pet name) رکھا ہے وہ ملاحظہ ہو۔ "مولوی صاحب" مولوی صاحب کے جی میں پڑھتے ہیں عمر کے لحاظ سے انکی معلومات بہت وسیع ہیں اگر آپ مولوی صاحب کی بات سن کر پوچھیں میاں آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا تو وہ ایک شان استغنے سے جواب دیں گے۔ سائنس پڑھتا ہوں کوئی مذاق تھوڑا ہے۔

چند روز کی بات ہے قدرت اللہ درزی کی دکان پر پتلون کا ناپ دینے گئے مولوی صاحب بھی ہمراہ تھے جب قدرت پتلون کی موری کے متعلق ہدایت دے چکے تو مولوی صاحب بولے۔ ابو اگر آپ غرارے پہنیں گے تو میں آپ کو اپنے ساتھ باہر نہیں لے جایا کروں گا۔

بڑی بڑی باتوں کی عظمت سے مجھے انکار نہیں اونچے اور عظیم مقاصد کردار کے اعلیٰ اوصاف ان سب باتوں کا میں احترام کرتا ہوں۔ بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جاتا کہ زندگی چھوٹی چھوٹی باتوں سے عبارت ہے اور شخصیت کے تمام تر حسن کا دارومدار پھولوں پر نہیں بلکہ پتیوں پر ہے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے موہوم دکھ، چھوٹے چھوٹے اللہ واسطے کے بغض، چھوٹے چھوٹے لاگ، چھوٹے چھوٹے لگاؤ ۔ چھوٹی چھوٹی بے وجہ دشمنیاں، چھوٹی چھوٹی ناراضگیاں، چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں، خوش فہمیاں، کج رویاں، یہ سب ایک عام شریف آدمی کے لئے چھوٹی چھوٹی لذتیں ہیں، غریبانہ عشرتیں ہیں، معصوم عیاشیاں ہیں یہ

وہ کھونٹیاں ہیں جن پر دوستی کی گٹھڑیاں ٹانگی جاتی ہیں۔

نورین سے میرے بڑے گہرے مراسم ہیں ہماری دوستی کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو برکت علی سے بیر ہے اور ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر برکت علی کے عیب گنتے ہیں۔

یار محمد میرا بہت پرانا دوست ہے۔ میں نے اسے اس لئے دوست بنایا تھا کہ وہ بھی گھر والی کے ہاتھوں مظلوم تھا۔ ہم تقریباً روز ملتے تھے۔ ادھر ادھر کی بات چھڑ جاتی ہے جو گھوم گھام کر چلتے کسی نہ کسی طور پر گھر والی پر آ ختم ہوتی ہے۔ اور پھر ہمارا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے کہ گھر والیاں بے وقوف ہوتی ہیں لہٰذا ان کی بات کو چنداں اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ یہ ہماری بات کا نقطہ عروج ہوتا ہے جس کے بعد محفل برخاست ہو جاتی ہے اور ہم دونوں میں گھر جانے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔

باہمی تعلقات اور دوستی کا پنچھی کردار کے پھولوں پر نہیں بیٹھتا شخصیت کی ٹیڑھی میڑھی شاخوں پر بیٹھتا ہے۔

کردار کی عظمتیں دل میں لگاؤ اور محبت کے دیپ نہیں جلاتیں صرف جذبہ تحسین پیدا کرتی ہے۔ لیکن اس جذبے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا خوف بھی پیدا ہو جاتا ہے اور پھر ان جانے میں نیچے ہی نیچے اجتناب کی اک رو چل پڑتی ہے۔

قدرت اللہ کے پاس آپ گھنٹوں بیٹھے رہیں وہ کسی برکت علی کی بات نہ چھیڑے گا گھر والی کی بے وقوفی کا ذکر نہ کرے گا۔ اس کی زندگی میں کوئی برکت علی نہیں جس کی نندا کر کے اسے سکون حاصل ہو۔ جسے برا بھلا کہہ کر اسے راحت محسوس ہو جسے نیچا دکھانے کے زبانی منصوبے بنا کر وہ اپنی زندگی میں تازگی پیدا کرے۔ قدرت اللہ کی زندگی میں کوئی ایسا شخص بھی نہیں جس کے گن گا کر اسے لذت محسوس ہو۔ اس کا کوئی دشمن نہیں۔

ویسے تو زندگی میں میرا بھی کوئی دشمن نہیں یہ نعمت ہر کسی کا حصہ نہیں۔ غالباً آپ کا بھی کوئی دشمن نہیں۔ لیکن ہم نے کئی ایک دشمن کھڑے کر رکھے ہیں دشمن نہ ہو تو ذاتی اہمیت کیسے قائم ہو۔ ذاتی اہمیت چاہے ہو یا نہ ہو اس کا احساس تو ہونا ہی چاہئے۔ یہ خیالی

دشمنیاں جو شریف لوگ پیدا کر رکھتے ہیں دشمنیاں نہیں ہوتیں جینے کے سہارے ہوتے ہیں۔

یہ قدرت اللہ کیسا انسان ہے جو اتنی چھوٹی سی حقیقت کو نہیں سمجھتا ویسے بہت بڑا دانشور ہے۔ سوجھ بوجھ کا مالک ہے۔ لیکن زندگی کے اہم حقائق کو نظر انداز کیے بیٹھا ہے۔

قدرت اللہ سے کسی شخص کی بات کرو ، جواب میں کہے گا اچھا آدمی ہے چاہے وہ سمگلر ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے اس نے قدرت اللہ کے خلاف زیر لبی تحریک چلا رکھی ہو۔

ایک روز ایک شاہ صاحب قدرت اللہ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔

قدرت اللہ شاہ صاحب سے ملنے کے بعد بہت مسرور تھا۔ کہنے لگا۔ خوب آدمی ہے۔ میں نے پوچھا کون تھا بولا ایک زبردست عامل ہے۔ شیطانی قوتیں زیر کر رکھی ہیں۔ لوگوں سے علانیہ پیسے بٹورتا ہے۔ بلیک میل بھی کرتا ہے مگر کام سب کا کر دیتا ہے۔ خوب آدمی ہے۔

ارے میں نے غور سے قدرت کی طرف دیکھا خوب آدمی ہے۔ قدرت اللہ کے لیے ساری دنیا کے آدمی خوب آدمی ہیں۔

ایمان سے کہیے کیا آپ نے ایسا منطق سنا ہے کہ اول درجے کا شیطان ہے، لوگوں کو بلیک میل کرتا ہے۔ لہذا خوب آدمی ہے یہ منطق انسان کا منطق تو نہیں ہاں اللہ تعالیٰ کا منطق ضرور ہے۔

اگر یہ منطق انسان کا ہوتا تو زندگی کا حسن ختم ہو جاتا۔ اگر یہ منطق اللہ تعالیٰ کا نہ ہوتا تو دنیا کا شیرازہ بکھر جاتا۔ تو کیا جناب قدرت اللہ صاحب اللہ تعالیٰ بننے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

قدرت اللہ کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس کی شخصیت پر روشنی نہ ڈال سکیں مفت میں ممتاز مفتی کا ذہن دھندلا تا ہے۔

اللہ واسطے کو چھوڑیئے قدرت اللہ کے دل میں کوئی جائز بغض نہیں۔ کوئی لاگ نہیں، اس کی طبیعت میں کوئی چڑ نہیں کج روی نہیں وہ کسی سے ناراض نہیں ہوتا اسے کبھی غصہ نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ منٹو نے کیا پتے کی بات کی تھی۔ میں کسی کی تعریف میں کچھ کہہ رہا تھا۔ منٹو نے چلا کر کہا مفتی چھوڑ یار کس کی بات کر رہا ہے تو۔ اس سالے کو غصہ بھی نہیں آتا۔

مانا کہ غصہ حرام ہے مانا کہ غصہ ایک ایسی چھری ہے جو انسان اپنے ہی سینے میں گھونپتا ہے مانا کہ غصے میں آ کر آپ انسانوں کی صف میں آ شامل ہوتے ہیں۔ اس سرکار میں پہنچ کر سبھی ایک ہو جاتے ہیں نہ کوئی محمود رہتا ہے۔ نہ کوئی ایاز۔ یہ قدرت کیسا ایاز ہے جو الگ صف بنائے کھڑا ہے جو ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائے بیٹھا ہے۔ حیرت ہے کہ اس کی یہ مسجد چلتی ہے ہمارے عام دربار سے زیادہ چلتی ہے لوگ اس کے گن گاتے نہیں تھکتے۔ لوگوں کی بات چھوڑیئے۔ وہ قدرت سے دور ہیں اس لئے جانتے ہیں میں جو قدرت سے قریب ہوں جو قطعی طور پر نہیں جانتا۔ میں بھی اس کے گن گانے پر مجبور ہوں۔

روزانہ بیسیوں لوگ قدرت سے ملنے آتے ہیں جو ملنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں خوشی خوشی گھر لوٹ جاتے ہیں جیسے مل لینا بذاتِ خود تکمیل کار ہو جنہیں مسلسل انتظار کے بعد مایوس لوٹنا پڑتا ہے وہ گھر پہنچنے سے پہلے اسے معاف کر چکے ہوتے ہیں جن کے کام ہو جاتے ہیں وہ اس کے گن گاتے ہیں جن کے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتے وہ یوں مطمئن جاتے ہیں جیسے ان کا مقصد کام نہیں محض ملاقات تھا۔

آپ قدرت اللہ کے گھر جائیں آپ کو علم ہو گا کہ وہ گھر پر موجود ہے اگر نوکر آ کر کہہ دے کہ صاحب گھر پر نہیں تو پتہ نہیں کس انجانے اصول کے تحت آپ کا تمام تر غصہ نوکر پر مرکوز ہو جائے گا۔ اور قدرت صاف بچ کر نکل جائے گا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ایک اعلیٰ افسر جو بہت قابل ہے کام کرنے میں انتھک ہے اور جس کے دل میں ملک کا درد ہے قدرت اللہ سے کہہ رہا تھا۔ یار سمجھ میں نہیں آتا ہم بھی

ملک کے لئے جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں لیکن جب نکتہ چینی کا موقع ہوتا ہے تو لوگوں کو ہمارا نام یاد آجاتا ہے اور جب واہ واہ کی محفل جمتی ہے تو تمہارا تذکرہ چھڑ جاتا ہے۔

ہاں مجھے اس افسر سے اتفاق ہے۔ مجھے اس افسر سے ہمدردی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اس نے کیا پتے کی بات کہہ دی۔ جس کے مفہوم کو ہم سب کو سمجھنا چاہئے لیکن ہم جانتے بوجھتے ہوئے نہ سمجھنے پر مصر ہیں۔

ظاہر ہے کہ قدرت اللہ ایک ایسا چمچہ ہے جسے سونے کا چمچہ عطا ہوا ہے جس کا نیک نامی چرچا کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کے دشمن بھی اس کی تعریف کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔

یہ سونے کا چمچہ اسے کس نے عطا کیا کیوں، کیوں آپ اور میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں۔ حالانکہ وہ ہماری صف میں شامل نہیں۔ وہ ہمارا دوست نہیں۔ وہ کسی کا دوست نہیں۔ اس کی شخصیت میں کھونٹیاں ہی نہیں جن پر دوستی کی گٹھڑی ٹانگی جا سکتی ہے۔ اس میں وہ عوامی خصوصیتیں نہیں جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں۔

اوصاف ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لاتے۔ کمزوریاں لاتی ہیں، بے بسیاں لاتی ہیں، محتاجیاں، کم ظرفیاں، کج رویاں لاتی ہیں۔

اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے جو ہم میں سے نہ ہو اسے ہم کبھی معاف نہیں کرتے۔ پھر ہم سب آپ اور میں کیوں اسے معاف کئے بیٹھے ہیں کیوں اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں شاید آپ اس کے جواز میں یہ کہیں اس لئے کہ قدرت اللہ ایک نیک آدمی ہے۔

یقین جانئے میں بھی نیک آدمیوں کی عزت کرتا ہوں۔ انہیں احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن پتہ نہیں کیوں اگر وہ قریب آجائیں تو گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے اٹھ کر چلا جاؤں، دور بھاگ جاؤں۔

پتہ نہیں کیوں مجھے خالص نیک آدمی سے عجیب سی بو آتی ہے۔ کوئی نیک آدمی آ جائے تو میں محسوس کرتا ہوں جیسے اس کا منہ بند چلا چلا کر کہہ رہا ہو ہٹ جاؤ، بچ جاؤ، نیک آدمی

آرہا ہے۔ پتہ نہیں نیکی کی یہ خصوصیت ازلی ہے یا رسمی۔ بہر صورت نیک آدمی سے بو آتی ہے بدبو نہیں۔ خالی بو، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خوشبو ہو لیکن وہ اتنی تیز ہوتی ہے اور اس قدر شدت سے آپ پر حملہ کرتی ہے کہ خوشی کا عنصر ختم ہو جاتا ہے اور بو سے چاروں اطراف بھر جاتے ہیں۔

پتہ نہیں کیوں خالص نیک آدمی میں نیکی کے اتنے ڈھیر لگ جاتے ہیں کہ آدمی دب جاتا ہے۔

چاہے کوئی خصوصیت ہو جو آدمی کو دبا دے چاہے وہ خصوصیت کتنی ہی مثبت کیوں نہ ہو وہ وصف کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اگر وہ آدمی کو دبا دے تو عفریت کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ بے شک قدرت اللہ نیک آدمی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس میں سے بو نہیں آتی اس کے قریب جا کر گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ دور بھاگنا تو درکنار پاس بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ آخر کیوں؟ قدرت اس اصول سے کیوں مستثنیٰ ہے۔ قدرت سے بو کیوں نہیں آتی۔ نیکی کے ڈھیر تو لگے ہیں لیکن آدمی ان ڈھیروں تلے دبنے کے برعکس ڈھیر کے اوپر بیٹھا ہے جیسے وہ ان ڈھیروں کا پایہ ستون ہو۔

قدرت اللہ ہماری صف میں نہیں کھڑا۔ وہ ہمارے مشاغل نہیں اپناتا۔ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں بیٹھا ہے پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے وہ ہم میں سے ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ آپ اسے برا سمجھنے کی کوشش کر دیکھیں مگر نہیں۔ اسے برا سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ قدرت کو برا سمجھنے کی کوشش بے سود ہے۔ خواہ مخواہ آپ احساسِ جرم کے پسینے سے بھیگ جائیں گے۔

قدرت اور میں دونوں خانہ خدا کے قریب بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا، نیک آدمیوں سے بو کیوں آتی ہے؟ وہ عفریت کیوں بن جاتے ہیں۔ اس نے کہا یہاں کوئی نیک آدمی نہیں یہاں اللہ کے سوا کسی کا چراغ نہیں جلتا۔ یہاں سب انسان ہیں خالی خولی انسان، یہ تمام گناہ گاروں کی جنت ہے یہ کہہ کر وہ عبادت میں مصروف ہو گیا۔

پھر جو میری نگاہ اس پر پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز مختلف تھا جیسے تاسف ندامت اور توبہ سے بند بند بھیگا ہوا ہو۔ ارے یہ کیا ڈھونگ ہے۔ جو شخص عام انسانی کمزوریوں سے بھی محروم ہو وہ یوں بیٹھے جیسے مجھ سے بھی بڑا گناہ گار ہو۔ اس پر مجھے غصہ آنے لگا۔ اب کیا گناہ گاری میں بھی یہ مجھ سے بازی لے جائے گا۔ میرا ایک ہی امتیاز ہے کیا وہ بھی خاک میں مل جائے گا۔ یہ مقام میری جنت ہے میری اس کی نہیں۔

میں نے بہت کوشش کی کہ میں بھی اسی طرح بیٹھوں جس طرح قدرت بیٹھا تھا۔

یقین جانئیے میں خالی گناہ گار ہی نہیں مجھے گناہ گار ہونے کا احساس بھی ہے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ میں عجز سے بھیگ جاؤں۔ خانہ خدا کے قدموں میں میرا ابھی رواں رواں حاضر ہو جائے۔ میں بھی اس احساس سے بھر جاؤں کہ میں اپنے اللہ کے حضور میں حاضر ہوں۔ سب بے کار مسلسل کوشش کے باوجود میں قدرت کا سا گناہ گارانہ انداز پیدا نہ کر سکا۔ حد ہو گئی وہاں نیک بن کر عزت کرواتا رہا اور یہاں گناہ گار بن بیٹھا۔ ابن الوقتی کی انتہا ہو گئی۔ مجھے طیش آ گیا۔ میں نے اللہ کے حضور میں دہائی دی، یا باری تعالیٰ یہ شخص جو میرے دائیں ہاتھ بیٹھا ہے جھوٹا ہے بے شک اس میں عجز ہے لیکن یہ گناہ گار نہیں۔ گناہ گار میں ہوں، میں۔

پندرہ روز اس پاک سرزمین پر بیشتر وقت ہم دونوں اکٹھے اللہ اور محمد کے حضور میں بیٹھے رہے۔

پندرہ روز وہ شہاب نہیں تھا۔ اہلکار نہیں تھا، دانشور اور ادیب کیا ہوتا، پڑھا لکھا ہی نہیں تھا۔ باپ نہیں تھا، شوہر نہیں تھا صرف انسان تھا۔ ایسا انسان جو احساس گناہ سے بھیگا ہوا ہو جیسے ابھی ابھی دانہ گندم کھانے کے بعد بہشت سے زمین پر پھینک دیا گیا ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے حضور آہ و زاری کرنے کے سوا اسے کوئی کام نہ ہو۔

ان پندرہ دنوں میں مجھ سے بھی زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اسے انجائنا کے کئی ایک دورے پڑ چکے تھے۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑاتا تھا۔

اس کے باوجود روز رات کے ڈھائی تین بجے وہ مجھے جگا دیتا۔ چلو مسجد جانے کا وقت ہو گیا۔

مسجد نبوی کے دروازے رات نو بجے بند ہو جاتے ہیں اور صبح تین ساڑھے تین بجے کھلتے ہیں جب باب جبرائیل کھلتا تو قدرت لڑکھڑاتا ہوا دھکے کھاتا اندر داخل ہوتا۔ میں دھکے دیتا بھی تھا وہ صرف کھاتا تھا۔ اس لڑکھڑاتے ہوئے نحیف و نزار بڈھے کو دیکھ کر میرے دل میں ترس پیدا ہو جاتا۔

سبز جالی کے قریب وہ ایک جگہ نفل پڑھتا دوسری جگہ دعا پڑھتا اور پھر فاتحانہ انداز میں مجھ سے کہتا چلو اب مسجد میں چلیں۔ یہیں کیوں نہ بیٹھیں۔ میں نے پہلی مرتبہ کہا۔ نہیں۔ وہ بولا۔ دوسروں کو بھی موقع دینا چاہیے۔

ایک روز رات کے نو بجے سفارت پاکستان کا ایک اہلکار ہماری قیام گاہ پر آیا۔ کہنے لگا شاہ فیصل نے پاکستان کے معزز مہمانوں کیلئے مسجد نبوی کو رات کے دس بجے کھولنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ آپ اطمینان سے جہاں چاہیں نوافل پڑھ سکیں گے۔ تشریف لے چلئے۔ قدرت پر ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے معذرت کی کہنے لگا آپ کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن میری طبیعت اچھی نہیں۔

اس رات تین بجے اس کی طبیعت حسب معمول اچھی تھی اور وہ باب جبرائیل سے داخل ہوتے ہوئے دھکے کھا رہا تھا، لڑکھڑا رہا تھا۔

ظاہر تھا کہ اسے گوارا نہ تھا کہ باب جبرائیل سے آستانہ مبارک میں کسی خصوصی حیثیت سے داخل ہو۔ آستانہ مبارک میں دھکے کھاتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے نحیف و نزار عام انسان کی حیثیت سے داخل ہونا۔ یہی اس کی معراج تھا۔

آپ ہی فیصلہ کیجئے کیا ان تفصیلات سے قدرت اللہ کی شخصیت کی گتھی سلجھتی ہے۔ انسانی کوتاہیوں کی طرف دیکھو تو وہ ہم سے الگ ہے، بلندیوں کی طرف دیکھو تو وہ انسان ہے۔ لیکن سرزمین حجاز کی یہ باتیں تو ایک الگ موضوع ہے جنہیں شاید میں کبھی ایک

الگ مضمون میں پیش کر سکوں۔

قدرت اللہ وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں۔ اس کے باوجود ہم اسے متبرک سمجھتے ہیں۔

اس بات میں یقیناً آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہر انسان کا جی چاہتا ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرے۔ دوسروں کو نصیحت کرنا ایک انسانی خواہش ہے ایک معصوم عشرت۔ ایسی لذت جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ جس کو نصیحت کی جائے اس کا کچھ نہیں بگڑتا چاہے وہ نصیحت پر قطعی طور پر عمل نہ کرے۔ چاہے گھر جا کر اس کا مضحکہ اڑائے۔ چاہے اس کان سنے اس کان اڑا دے۔ لیکن نصیحت کرنے والے کی چند ساعت کیلئے ایک حیثیت بن جاتی ہے۔

احساس برتری کی ایک رو چلتی ہے۔ خون میں ایک گرمی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں روشنی چمکتی ہے۔ چند ساعت کیلئے گزشتہ تلخیاں معدوم ہو جاتی ہیں۔ جینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی سی عشرت کس قدر معصوم اور کتنی صحت بخش ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے ہر کس کو نصیحت کروں۔ ہر آتے جاتے کو روک کر کہوں نہ بھائی اس طرح نہیں کیا کرتے۔

بچپن میں جب میرے بزرگ مجھے نصیحتیں کیا کرتے تھے تو مجھے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ خود تو کرتے نہیں مجھے کرنے کیلئے کیوں کہتے ہیں۔ پھر مولوی کفایت احمد سے مل کر سارا پول کھل گیا۔ بات سمجھ میں آگئی۔ مولوی صاحب میرے پڑوسی تھے۔ جب وہ اپنی بیوی سے جملہ محلے والوں کی خامیوں پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے اکتا جاتے تو میرے پاس آ بیٹھتے اور مجھے سمجھاتے کہ دوسروں کی غیبت کرنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔

اگر آپ چند ساعت کیلئے اجلے کپڑے پہن کر میلے لوگوں کو صفائی کی تلقین کریں تو یہ ایک معصوم سی لذت ہے۔ قدرت اللہ اس انسانی لذت سے سراسر منکر ہے۔ وہ کبھی آپ کو نصیحت نہیں کرے گا۔ اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے ظاہر ہو کہ وہ

دوسروں کی طرح میلا نہیں وہ کبھی اجلے کپڑے پہن کر آپ کے پاس نہیں بیٹھے گا۔

اس نے کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ نامناسب ہے۔ آپ اس کے پاس بیٹھ کر شراب پئیں وہ آپ کو کبھی نہیں ٹوکے گا۔ بلکہ وہ آپ کے اس فعل کو چنداں اہمیت ہی نہ دے گا جیسے آپ شراب نہیں بلکہ شربت پی رہے ہوں۔ آپ اس کی موجودگی میں کفر والحاد کی باتیں چھیڑ دیں وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہے گا اور نماز کے وقت باتھ روم کا بہانہ کر کے خلوص اور خشوع سے سجدہ ادا کرنے کے بعد واپس آکر اسی توجہ سے آپ کی باتیں سننے لگے گا۔ اگر کفر والحاد کی باتوں میں گستاخی کا عنصر ناقابل برداشت ہو جائے تو وہ بڑی چابکدستی سے موضوع بدل دے گا اور آپ کو یہ احساس بھی نہ ہو گا کہ موضوع بدلا نہیں بلکہ بدل دیا گیا ہے۔

ہاں ایک مرتبہ قدرت اللہ نے مجھے نصیحت کی تھی۔ اس کے کوائف بھی کافی سبق آموز ہیں۔ اس نصیحت کو حاصل کرنے کیلئے مجھے گھنٹوں محنت کرنی پڑی۔ جیسے کہ ایک بوند کی امید میں سوکھے ہوئے لیموں کو دبا دبا کر انگلیاں تھک جاتی ہیں۔

ہم دونوں مسجد نبوی میں بیٹھے تھے۔ مسجد نبوی میں وہ ہمارا آخری دن تھا۔

میں نے کہا۔ اس مقدس زمین سے کچھ لے کر جانا چاہیے۔

اچھا؟ وہ بولا۔

ایسی چیز جو زندگی بھر ساتھ رہے۔

ہاں، وہ بولا، زندگی بھر ساتھ رہے۔

کیا حرج ہے۔ اس نے جواب دیا۔

کیا لے کر جاؤں۔

کیا لے جانا چاہتے ہیں آپ؟

کوئی ایسی چیز جسے میں نباہ سکوں۔

ہاں یہ تو ہے۔

صوم وصلوٰت نہیں لے جاسکتا۔

کیوں؟

مجھ سے نبھے گا نہیں۔

اچھا۔

مشکل ہے، بے قاعدہ آدمی کیلئے مشکل ہے۔

ہاں بے قاعدہ آدمی کیلئے مشکل ہے۔

کوئی کردار کی بات ہو۔

ہاں کردار کی بات ہو۔

کردار کی بات سب سے بڑی سنت نہیں کیا۔

ہاں سب سے بڑی سنت ہے۔

مثلاً کیا ہو؟ میں نے پوچھا۔

کیا ہو؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔۔۔ کیا ہو سکتا ہے۔

مثلاً یہ کہ دل میں کسی کے بارے میں میل نہ آنے دوں گا، کچھ ایسا ہو۔

کیوں کیا خیال ہے۔

ہاں کچھ ایسا ہو، وہ بولا۔

کوئی واضح بات ہو۔ جس کے خدوخال واضح ہوں۔

ہوں، وہ بولا۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔

وہ کیا؟

اگر آپ پسند کریں تو۔

ہے کیا میں نے پوچھا۔

یہ کہ دوسروں سے خوش نہ رہ سکا تو کم از کم کسی سے ناخوش نہ رہوں گا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ یہی تو قدرت اللہ کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے

وہ ہر شخص سے خوش رہتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کسی سے ناخوش ہو۔

قدرت اللہ کی محبت کے کوائف انوکھے ہیں۔ ویسے تو بظاہر ہر شخص کی محبت کے کوائف انوکھے ہوتے ہیں۔ کوئی محبوبہ کو فرشتوں کی سی پاکیزگی بخش کر اپنے آپ پر حرام کر لیتا ہے اور بقیہ زندگی آہیں بھرنے اور غم کھانے کی لذت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ کوئی محبوبہ کو بیسوا کی حیثیت عطا کر کے روز دل پر تازہ چوٹ کھانے کا سامان پیدا کرتا ہے۔ کوئی پھولوں کی خوشبو سے مستی اخذ کرتا ہے۔ کوئی پتیاں نوچنے کی لذت اپناتا ہے کوئی کلی کلی رس چوستا ہے۔ لیکن یہ دلچسپ کوائف محبت کے نہیں بلکہ جنس کی آمیزش سے پیدا ہوتے ہیں۔ محبت بذات خود پھیلے ہوئے ساکن سمندر کی طرح ہمہ گیر جذبہ ہے۔ جب محبت میں جنس کا خمیر اٹھتا ہے تو طوفان چلتے ہیں۔ چھینٹے اڑتے ہیں۔ جھاگ پیدا ہوتا ہے۔ یوں محبت کے کوائف مرتب ہوتے ہیں۔

قدرت ایک ازلی محبوب ہے۔ یہ شمع پروانوں کو دعوت دینے کیلئے جلتی ہے۔ پروانے اکٹھا ہو جائیں تو اس کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ شعلے کی آگ کو جذب کر کے معدوم کر دے تاکہ صرف روشنی ہی روشنی باقی رہ جائے۔ ٹھنڈی روشنی، جو جلاتی نہیں بلکہ منور کر دیتی ہے۔ شعلے کی آگ کو نور میں بدلنے کے عمل میں قدرت اذیت کے جن مراحل سے گزرتا ہے انہیں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

قدرت اللہ ایک ایسا انوکھا تپسوی ہے جس کی اپنی خواہش ہے کہ کوئی راج نرتکی اس کے گیان دھیان کو توڑنے کے لئے اس کے گرد بروے کا ناچ ناچے۔ ناچ ناچ کر ہار جائے۔ اور پھر دھیان توڑنے والی تپسوی کے چرنوں میں خود دھیان لگا کر بیٹھ جائے۔ اور بالآخر تپسوی سے بے نیاز ہو جائے۔

اس لحاظ سے قدرت اللہ ایک انتہ چار ہے۔ جو ازلی خواہش سے بے نیاز ہونے کے لئے عورت کو استعمال میں لاتا ہے۔ جو تن کی آگ کو نور میں بدلنے کے لئے نسائی شعلے کو قرب کی دعوت دیتا ہے وہ ایک انوکھا فنکار ہے جو آگ کو آگ سے بجھاتا ہے۔ ڈوبنے سے بچنے

کے لئے پانی میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

میں نے ان آنکھوں سے اسے گیان دھیان میں سرشار بدھ بنے دیکھا ہے۔ میں راج نرتکیوں کو اس کے گرد ہروے کا ناچ ناچتے دیکھا ہے۔ ایسی راج نرتکیاں جن کے ایک آسن کا متحمل ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا۔ آگ کو نور میں بدلنے کی جانکا جمد وجمد میں، میں نے اسے ساحل کی تپتی ریت پر مگرمچھ کی طرح تڑپتے دیکھا ہے۔

بیشتر راج نرتکیاں بار کرانا کے بندھن سے آزاد ہو گئیں۔ اور فریضہ حج ادا کر کے زندگی کے پرسکوں حجروں میں سمائیں۔ ایسی بھی تھیں جو اپنی بار کو برداشت نہ کر سکیں اور مایوسی میں خواب آور گولیوں کے سہارے کی طرف بڑھیں۔

میری آخری دلیل بظاہر بے حد بوری ہے یہ دلیل دوسروں کے بیانات پر مبنی ہے یہ بیانات عقل و ادراک سے عاری معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ ان سری سری بے مقصد بیانات نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ اگرچہ اب بھی کبھی کبھار بیٹھے بٹھائے مجھے یہ بیانات مضحکہ خیز معلوم ہونے لگتے ہیں۔

یہ ۱۹۵۸ کی بات ہے جب قدرت اللہ نے مجھ سے ملنا شروع کیا اور ہم تقریباً روز ملتے تھے۔ ان دنوں میں کراچی میں ناظم آباد میں مقیم تھا۔ دو روز کے لئے میرے ہاں ایک مہمان آٹھہرے۔ یہ صاحب شورکوٹ کے کسی بزرگ کے بڑے قائل تھے۔ بات بات پر ان کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں شورکوٹ کے بزرگ کو خط لکھوں اور دعا کے لئے درخواست کروں، جان چھڑانے کے لئے میں نے ایک مختصر سا روکھا سا خط لکھ دیا۔

چند روز کے بعد ان کا جواب موصول ہوا لکھا تھا آپ جن صاحب سے آج کل مل رہے ہیں انہیں ہمارا اسلام کہئے۔ یہ شخص مدینے کا خاص غلام ہے۔ یہ شخص دنیا بھی لوٹ کرلے گیا۔ اور دین بھی۔

اس خط کو پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ کیا وہ قدرت اللہ کی بات کر رہے تھے دین کا تو مجھے علم نہ تھا۔ لیکن جو دنیا قدرت اللہ نے لوٹی تھی اس سے میں خاصا واقف تھا۔

ان دنوں قدرت اللہ صدر کا سیکرٹری تھا۔ لیکن وہ اپنے دفتر میں یوں داخل ہوا کرتا تھا جیسے جونیئر کلرک جو لیٹ آیا ہو اور ڈرتا ہو کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اس کی افسری برائے نام معلوم پڑتی تھی۔ اور وہ خود جیسے اپنی افسری پر معذرت خواہ تھا۔ جب پہلی مرتبہ میں نے قدرت اللہ کو فون کرتے دیکھا تو مجھے لالہ رام لال یاد آ گئے۔ لالہ رام لال ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب کبھی لالہ جی کو کسی افسر کا ٹیلیفون آتا تو لالہ جی لپک کر اپنی پگڑی اٹھاتے اسے سر پر رکھ کر ننگے پاؤں کھڑے ہو جاتے اور فون پر کہتے جی مہاراج میں لالہ رام لال بول رہا ہوں مہاراج۔

اگرچہ بظاہر قدرت پوری طرح سے سوٹ بوٹ میں ملبوس تھا لیکن انداز سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اس کے پاؤں ننگے ہیں سر پر بھاری پگڑی رکھی ہوئی ہے اور وہ باادب کھڑا کہہ رہا ہے۔ جی مہاراج میں لالہ رام لال بول رہا ہوں۔

صاحب کے بلاوے پر میں نے قدرت اللہ کو کاپی پنسل اٹھا کر صدر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئی دیکھا ہے۔ جیسے کسی کلرک کو عارضی طور پر پی اے کا کام مل گیا ہو۔

یہ حال تھا قدرت اللہ کی افسری کا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی شخصیت میں حکومت یا افسری کا کوئی عنصر نہیں۔ نفسیاتی تحقیق کے ادارے میں جہاں میں کام کیا کرتا تھا۔ امیدواروں کی تجزیاتی رپورٹ میں ایک خانہ ہوتا تھا جس میں لکھا تھا کیا امیدوار میں افسر بننے کی صلاحیت ہے۔ افسر بننے کی صلاحیت کے کوائف کیا تھے۔ ۱۔ احساس نہ ہو۔ ۲۔ شدت نہ ہو۔ ۳۔ پچھتانے کی عادت نہ ہو۔ ۴۔ طبیعت میں ادبی یا فنکارانہ رنگ نہ ہو۔ ۵۔ اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھے۔ ۶۔ فوری فیصلہ کر سکے چاہے غلط ہو۔ ۷۔ اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ جو میں کرتا ہوں درست ہے۔ ۸۔ حکومت کی بو ہو۔ ۹۔ رحم یا ترس کے جذبے سے پاک ہو۔ ۱۰۔ انصاف کے بجائے ایڈمنسٹریشن کی لگن ہو۔

اگر آئی سی ایس کے امتحان میں قدرت اللہ کی شخصیت کی رپورٹ مجھ سے لکھوائی جاتی تو میں لکھتا امیدوار میں افسر بننے کی صلاحیت نہیں۔

رہا ذہانت کا مسئلہ، میں تسلیم کرتا ہوں کہ قدرت اللہ بے حد ذہین ہے بے شک افسر میں ذہانت کا ہونا ضروری ہے لیکن اتنی نہیں جتنی قدرت اللہ میں ہے۔ اس کے علاوہ افسر میں ذہانت اس قسم کی ہونی چاہیے جو پیچھے پیچھے چلتی ہے آگے آگے نہیں۔

قدرت اللہ اپنی ذہانت یوں چھپا چھپا کر رکھتا ہے جیسے وہ چوری کا مال ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ذہانت چھپانے کی چیز نہیں۔ وہ تو ایک زیور ہے جسے دانشور ماتھے پر ٹیکے کی طرح لگاتے ہیں، اس کی نمائش کرتے ہیں، اس سے شخصیت کا حسن اخذ کرتے ہیں۔ یہ قدرت اللہ کیا چیز ہے کہ ماتھے کا ٹیکہ کوٹ کے اندر کی جیب میں چھپا کر رکھتا ہے۔

دنیا لوٹنے کی بھی ایک تفصیل سن لیجئے۔ سکندر مرزا کے دور میں صدر گھر میں رکشے کا داخلہ ممنوع تھا۔ لیکن قدرت اللہ روز رکشے میں دفتر آتا تھا۔ جب قدرت اللہ کا رکشا چیختا چلاتا دھواں اڑاتا ہوا صدر گھر میں داخل ہوتا ہے تو سب افسروں اور اہلکاروں کو علم ہو جاتا کہ قدرت اللہ دفتر آ گیا ہے۔ کہتے ہیں سکندر مرزا اس وقت قلم رکھ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اور پھر آپ ہی آپ مسکرایا کرتے۔ اگرچہ سکندر مرزا میں مزاح کی بڑی صلاحیت تھی لیکن آخر تھے تو بادشاہِ وقت۔ ایک روز جب قدرت اللہ کے رکشے نے بہت اودھم مچایا تو تالی بجا کر بولے کوئی ہے جو ہمیں اس رکشا سے نجات دلائے۔

سکندر مرزا کی یہ بات سارے صدر گھر میں افواہ کی طرح پھیل گئی۔ پھر مشوروں اور پیش کشوں کا ایک تانتا لگ گیا۔

کسی نے کہا صدر گھر میں موٹریں بے کار پڑی رہتی ہیں پڑے پڑے زنگ لگ جاتا ہے اگر ایک موٹر آپ کے ہاں بھجوا دیں تو کیا حرج ہے۔ دوسرے نے کہا ہر روز صبح ایک کار یہاں سے جاتی ہے اگر آپ پسند کریں تو واپسی پر آپ کو دفتر لے آیا کرے۔

دھیرے دھیرے بات سیٹھوں تک پہنچی چار ایک سیٹھوں نے قدرت اللہ کو کار تحفتاً دینے کی پیش کش کر دی۔

آخر بات کلرکوں تک پہنچی۔ کلرک لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں ہر بات پر رول

اور ریگولیشن کا پردہ ڈالنے کی مہارت کو کام میں لاتے ہیں۔ ایک نے کہا حضور آپ پسند کریں تو جی پی فنڈ سے کار کے لئے قرضے کی عرضی لکھ دوں۔ دوسرے نے ہوشمندی سے قدم اٹھایا۔ پہلے قدرت کی پے بل فائل کا مطالعہ کیا۔ بات واضح ہو گئی۔ سیکرٹری ہونے کے باوجود کٹ کٹاؤ کے بعد قدرت کی نقد تنخواہ دفتر کے سیکورٹی افسر سے بھی کچھ کم نکلی۔ کلرک نے مناسب موقع پا کر کہا سر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کار ایڈوانس آج ہی لے لیں اور قسط کی ادائیگی کچھ عرصہ بعد شروع ہو۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت نے ایک چھوٹی سی کار خرید لی جسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے صدر گھر کی کسی کار نے بچہ دیا ہے۔ صدر گھر کے سنتری قدرت کی کار کو ایش ٹرے کار کہا کرتے تھے۔

کیا یہ تھا وہ شخص جس نے دنیا کو لوٹ لیا تھا۔ یقیناً شور کوٹ کے بزرگ بے تکی ہانک رہے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیا پتہ انہوں نے اپنے خط میں کسی اور شخص کے متعلق لکھا ہو۔ لیکن چند روز کے بعد بات واضح ہو گئی۔ شور کوٹ سے ایک اور خط موصول ہوا لکھا تھا ہم آپ کے لیے دعاگو ہیں کیا آپ نے ہمارا اسلام قدرت اللہ شہاب تک پہنچا دیا تھا۔

علم نجوم میں میری دلچسپی کو دیکھ کر قدرت نے مجھ سے کہا مفتی صاحب آپ محترمہ سے ملیں۔ وہ کون ہیں۔ میں نے پوچھا کہنے لگے وہ ایک نیک اور پاکیزہ خاتون ہیں جنہیں مستقبل یوں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے یہ سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی قائدِ اعظم کی تصویر۔

اگلے روز ہم قافلے کی صورت میں محترمہ کے گھر پہنچے۔ احمد بشیر، ابنِ انشاء، خلیق ابراہیم، قیصر اور میں۔

قدرت نے جو کچھ محترمہ کے متعلق کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ محترمہ نیک اور پاکیزہ خاتون تھیں اس کے علاوہ وہ صاحبِ نظر بھی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد وہ خاتون قدرت اللہ کے گھر آئیں کہنے لگیں میرا ارادہ تھا کہ اعتکاف کروں۔ کل رات، مجھے اشارہ کیا گیا ہے کہ کسی پاکیزہ مکان میں اعتکاف کرو اور ساتھ ہی آپ کا گھر دکھایا گیا ہے لہذا آپ اجازت دیں تو میں یہاں اعتکاف کروں۔

کیا ساری کراچی میں صرف قدرت کا گھر پاکیزہ تھا کیا قدرت اللہ کے گھر کی اس قدر، قدرو منزلت تھی اور قدرت کا گھر کیا تھا ایک میاں ایک بیگم اور چاروں طرف پھیلی ہوئی متبرک اداسی۔

پھر قدرت اللہ راولپنڈی میں آ مقیم ہوئے۔ ایک روز قدرت اللہ کے نام ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط خوشاب کے ایک شب بیدار ایڈووکیٹ ملک صاحب کا تھا۔ لکھا تھا۔ میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ کے ہاں کوئی بچہ نہیں۔ لہذا ہر روز تہجد کی نماز پڑھ کر میں آپ کے لئے دعا مانگا کرتا تھا۔ کل رات چند ساعت کے لئے ایک بچہ میری گود میں ڈال دیا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ قدرت اللہ کو خوشخبری دے دو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کے ہاں بچہ ہو گا۔

ایک سال کے بعد قدرت اللہ کے گھر بچہ تولد ہوا۔ حالانکہ ڈاکٹری اصول کے مطابق خونی نامناسبت کی وجہ سے بچہ پیدا ہونے کا امکان بعید از قیاس تھا۔

لندن کے اس ڈاکٹر کا بیان ہے جس نے بچے کی ولادت کیلئے آپریشن کیا تھا کہ:

''میں مذہبی آدمی نہیں ہوں، مشکل کے وقت مجھے خدا کی طرف رجوع کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ معجزہ میرے لئے ایک بے معنی لفظ ہے چونکہ میں حقائق کی دنیا میں رہنے کا عادی ہوں، دعا کے مفہوم سے میں آشنا نہیں۔ پتہ نہیں اس روز مجھے کیا ہوا جب میں ڈاکٹر عفت شہاب کے بے جان بچے کو شیشے کے مرتبان میں ڈال کر مسلسل چار گھنٹے اس کے پاس بیٹھا رہا۔ ان جانے میں میں نے انگلی پر انگلی رکھ کر صلیب کا نشان بنا لیا۔ میرے دل کی گہرائیوں سے ایک ان سنی ان جانی آواز ابھری، یا خدا اس بچے کو زندگی دے دے۔

چار گھنٹے میں یوں ہی بیٹھا رہا۔ اس بچے کے پاس بیٹھا رہا جس کی زندگی کی کوئی امید نہ تھی۔ میری انگلیاں صلیب بنی رہیں۔ وہی ان جانی آواز میرے دل کی گہرائیوں میں گونجتی رہی۔ پھر چار گھنٹے بعد جب پہلی مرتبہ بچے میں حرکت پیدا ہوئی تو پتہ نہیں کیوں میری آنکھیں شکر گزاری کے آنسوؤں سے پرنم ہو گئیں''۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا شب بیدار عابد قدرت اللہ میں کیوں دلچسپی لے رہے تھے۔ پاکیزہ خواتین کو اعتکاف کیلئے قدرت اللہ کا گھر کیوں دکھایا جا رہا تھا۔ دہریے ڈاکٹر قدرت اللہ کے بچے کیلئے دعا کرنے پر مجبور تھے۔ قدرت اللہ کون ہے، میرے سامنے ایک سوال آ کھڑا ہوا۔ پھر بھائی جان نے اس سوال پر گویا مہر ثبت کر دی۔

بھائی جان میرے بھائی نہیں ایک بزرگ ہیں۔ ان میں چند ایک خصوصیات نمایاں ہیں۔ وہ بے حد خلیق ہیں۔ طبیعت میں بلا کا عجز ہے کم گو ہیں۔ نکتہ چینی سے اجتناب کرتے ہیں اور انہوں نے دوسروں کی بات میں کبھی دخل نہیں دیا۔ انہی خصوصیات کی بنا پر ہم بھائی جان کی عزت کرتے ہیں۔ بھائی جان کے قدرت اللہ سے مراسم نہ تھے۔ معمولی سا تعارف، خالی علیک سلیک۔

ایک روز بھائی جان کی موجودگی میں اشفاق احمد آ گیا۔ آتے ہی اس نے قدرت کا تذکرہ چھیڑ دیا اور بے تکلفانہ پیار سے قدرت کو برا بھلا کہنے لگا۔ بھائی جان کا منہ سرخ ہو گیا وہ اٹھ بیٹھے اور غیر از معمول جلال میں کہنے لگے ''مفتی صاحب آپ انہیں سمجھا دیجئے، بے شک یہ ان کے بے تکلف دوست ہیں لیکن ہمارے سامنے ان کے متعلق ایسی باتیں نہ کہا کریں۔ ہم برداشت نہیں کر سکتے''۔ یہ کہہ کر بھائی جان چلے گئے۔

اشفاق کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ یہ بھائی جان کو کیا ہوا۔ بھائی جان نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ قدرت اللہ کون تھا جس کے بارے میں ایسی ویسی بات بھائی جان نہیں سن سکتے تھے۔ میرے لئے قدرت اللہ کے اسرار پر مہر ثبت ہو گئی۔ قدرت اللہ کیا ہے۔ قدرت اللہ کون ہے؟ ساری فضا سرگوشیوں سے بھر گئی۔ پھر قدرت اللہ ہالینڈ میں سفیر بن کر چلے گئے۔

بیورو میں میرا ایک ہم کار دوست صغیر ہے۔ صغیر کو قاضی صاحب سے عقیدت ہے۔ قاضی صاحب ایم ای ایس میں ملازم ہیں۔ ان کا واحد شغل اللہ اللہ کرنا ہے۔ ان کی پاکیزگی اور بے غرض خدمت خلق کی وجہ سے ان کے گھر پر سائلوں کا تانتا لگا رہتا

ہے۔ صغیر نے کہا مفتی آؤ تمہیں قاضی صاحب سے ملاؤں۔

قاضی صاحب کے کمرے میں جابجا اللہ اور محمد کے کتبے لٹک رہے تھے۔ فرش پر تسبیحوں کا ڈھیر لگا تھا۔ درمیان میں ایک سادہ لوح دیہاتی بیٹھا تھا جس کے ماتھے پر نیکی اور عبادت کی محراب بنی ہوئی تھی۔

قاضی صاحب بڑے اخلاق سے ملے اور صغیر سے باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں میں بڑا اثر تھا۔ نہ جانے صغیر کو کیا سوجھی کہنے لگا۔ قاضی صاحب مفتی صاحب کا ایک دوست ملک سے باہر گیا ہوا ہے دیکھئے تو وہ کب واپس آئے گا۔

"آپ کے دوست کا کیا نام ہے"؟ قاضی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ قدرت اللہ، میں نے جواب دیا۔ جان بوجھ کر میں نے قدرت اللہ کے نام سے شہاب حذف کر دیا۔ قاضی صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی گردن لٹک گئی۔ کمرے پر خاموشی طاری ہو گئی۔ دفعتاً قاضی صاحب چونکے جیسے انہیں دھچکا لگا ہو۔ بڑی عاجزی سے بولے یہ تم نے کیا کیا۔ بکری کو شیر کے سامنے ڈال دیا۔ صغیر جی میں تو ایک چھوٹا آدمی ہوں۔ بہت چھوٹا، چھوٹی چھوٹی خدمتیں کر سکتا ہوں۔ یہ آپ نے کیا کیا مجھ عاجز کو شیر کے سامنے ڈال دیا۔

کیا شیر سے ان کا مطلب قدرت اللہ تھا۔ کیا قدرت اللہ شیر ہے۔ قدرت اللہ میری نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوا اور فون کے چونگے میں منہ ڈال کر بولا، نہیں نہیں مہاراج میں تو لالہ رام لال بول رہا ہوں، لالہ رام لال۔

"مفتی جی"، بھائی جان غصے میں بولے، "ان کے متعلق ہم ایسی بات برداشت نہیں کر سکتے "یہ شخص دین اور دنیا دونوں لوٹ کر لے گیا"۔ شور کوٹ کے بزرگ نے قہقہہ مارا۔ قدرت اللہ کون ہے، کون ہے۔ فضا سرگوشیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں بھائی جان کی طرف بھاگا میں نے کہا بھائی جان ایک بات بتا دیجئے۔ قدرت اللہ کون ہے؟ وہ مسکرائے پھر بولے "مفتی جی وہ آپ کے دوست ہیں انہی سے کیوں نہیں پوچھتے آپ"۔

پھر میں نے بڑی محنت سے خوشاب کے اس شب بیدار عابد اڈوکیٹ ملک صاحب

کا پتہ لگایا جس نے قدرت کو فرزند کی ولادت کی خبر دی تھی۔ لاہور میں ملک صاحب ایک ویران سی کوٹھی میں مقیم تھے۔ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ پیشتر اس کے کہ میں ان سے کچھ پوچھتا انہوں نے خود ہی قدرت کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگے۔ "سمجھ میں نہیں آتا ایک سال سے مدینہ منورہ سے شہاب صاحب کی ہالینڈ سے واپسی کی منظوری آچکی ہے پھر وہ کیوں ہالینڈ سے واپس آنے میں لیت و لعل کر رہے ہیں"۔ مدینے شریف سے منظوری آچکی ہے۔ میں نے دہرایا۔ ملک صاحب ایک بات بتا دیجئے قدرت اللہ کون ہے۔ میں نے پوچھا۔

ملک صاحب مسکراتے ہوئے بولے ہمیں پوری طرح علم نہیں۔ چلیئے آپ کو ایک بزرگ کے پاس لیے چلتے ہیں یہ بزرگ قدرت اللہ شہاب میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ جب بھی شہاب صاحب کے متعلق کسی کمیٹی یا کانفرنس میں کوئی مسئلہ زیر غور ہوتا ہو تو یہ بزرگ لازماً وہاں پہنچ جاتے ہیں اور شہاب صاحب کے حق میں فیصلہ ہونے کیلئے پوری جدوجہد کرتے ہیں۔

میو ہسپتال کے سامنے ملک صاحب ایک گلی میں مڑ گئے۔ گھوم پھر کر سامنے ایک مسجد میں جا داخل ہوئے۔ مسجد سے ملحقہ مزار پر کھڑے ہو کر مجھ سے کہنے لگے فاتحہ پڑھ لیجئے۔

فاتحہ پڑھ کر ہم باہر نکلے "یہ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ ہیں"۔ ملک صاحب نے کہا "جب داتا صاحب لاہور میں داخل ہو رہے تھے تو ان کا جنازہ جا رہا تھا۔ جب بھی لاہور آئیں یہاں حاضری دیا کیجئے"۔

ارے تو یہ تھے وہ بزرگ، میں حیران رہ گیا۔ لیکن یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ یہ سب دلائل بودے ہیں۔ میں خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں۔

اب مجھے علم ہوا ہے کہ بات کہنا اور چیز ہے بات کا پہنچنا اور چیز ہے۔ ضروری نہیں کہ کہنے سے بات کھل بھی جائے۔ ہم صرف بات کہہ سکتے ہیں بات کھولنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ گزشتہ سات سال سے میں نے چیخ چیخ کر بات کہی ہے۔ اپنے دوستوں سے کہی ہے۔

قاری سے کہی ہے۔ قدرت کے عزیزوں سے کہی ہے۔

سب میری بات کو سن کر مسکرا دیتے ہیں۔ اب میں نے جانا ہے کہ بات کہنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک پہنچانے والے کو بات کھولنا منظور نہیں۔

ممتاز مفتی کی دیگر کتب
لبیک
علی پور کا ایلی
الکھ نگری
تلاش
پیاز کے چھلکے
غبارے
ان کہی